

نئی فرد قرار داد جرم

مولانا امین احسن اصلاحی

رسالہ الفرقان دہشتور بابت ماہ ذی قعدہ ۱۳۷۷ھ میں ہمارے مخدوم دوست مولانا محمد منظور نعمانی نے ”جماعت اسلامی اور اس کے خلاف فتوے“ کے عنوان سے ایک طویل مضمون تحریر فرمایا ہے۔ اس مضمون کے دو حصے ہیں۔ اس کے پہلے حصہ میں، جو مختصر ہے، انہوں نے اُن مفتیان کرام کو مخاطب فرمایا ہے جنہوں نے پچھلے دنوں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے خلاف فتوے صادر فرمائے ہیں۔ اور اس کے دوسرے حصہ میں، جو خاصا طویل ہے، مولانا نے جماعت اسلامی کے ذمہ داروں کو مخاطب فرمایا ہے۔

مفتیان کرام کو مخاطب کر کے انہوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی میں جہاں بہت سے پہلو ضرر کے ہیں وہاں اس کا ایک یہ مفید پہلو بھی ہے کہ اس کی دعوت اور اس کے ٹریچر سے بہت سے مغرب زدہ مسلمانوں کو ایمان نصیب ہو رہا ہے، اس لیے یہ بات کچھ اچھی نہیں سمجھتی کہ آپ حضرات نے ان کو ایک دم سے کافر ہی بنا ڈالا، وہ سزا کے مستحق تو ضرور تھے لیکن انہی سزا کے مستحق نہیں تھے۔ پھر مولانا نے ان کو کچھ مفید مشورے دیے ہیں کہ اگر جماعت اسلامی کے خلاف کوئی ہم چلائی ہی ہے تو اس کو ان لائنوں پر چلانا چاہیے۔

جماعت اسلامی کے ذمہ داروں کو مخاطب کر کے انہوں نے جو کچھ فرمایا ہے اس کو انہوں نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک حصہ میں انہوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ جماعت اسلامی کی ان مضمرات اور خرابیوں پر نظر ڈالی ہے جن کو وہ یا ان کے دوسرے ہم خیال محسوس کرتے ہیں۔ اور دوسرے حصے میں اُن خرابیوں کو دور کرنے کے لیے ازراہ نوازش کچھ عملی تدابیر بیان فرمائی ہیں۔

مضمون کا جو حصہ مفتیان کرام سے متعلق ہے اس کی نسبت ہم کچھ عرض کرنے کا حق نہیں رکھتے۔

اس کے بارے میں حضرات متقیان کرام ہی بہتر طریق پر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے حق میں مولانا کی شفاعت اور خود ان کے لیے مولانا کے قیمتی مشورے کس حد تک لائق قبول ہیں۔ مولانا ان کے گھر کے آدمی ہیں اگر وہ مولانا کے مشورے قبول کریں گے تو اس میں ان کی کوئی ہتک نہیں ہوگی۔ اور اگر خدا نخواستہ ٹھکرا دیں گے تو ان شاء اللہ مولانا اس سے آزرہ بھی نہیں ہونگے۔ باقی رہے ہم نیاز مند تو ہم ان کے ہر فیصلہ پر راضی ہیں اور انشاء اللہ ہر زیادتی پر صبر کریں گے۔ القبتہ مضمون کے اس حصہ سے تضرع کرنا ہمارے لیے ناگزیر ہے جو مولانا نے ہمیں مخاطب کر کے لکھا ہے۔ اور میں مولانا کو یقین دلانا ہوں کہ جس جذبہ اصلاح سے مجبور ہو کر انہوں نے یہ مضمون رقم فرمایا ہے اسی جذبہ اصلاح سے مجبور ہو کر میں بھی یہ سطوریں حوالہ قلم کر رہا ہوں۔

میں ابتداء سے مضمون ہی میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے اس بات کی کوئی شکایت نہیں ہے کہ مولانا نے اپنے ان احساسات کو پبلک کے سامنے لانے کے لیے ایک ایسا زانا منتخب کیا جبکہ پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہ جماعت اسلامی کو بدنام کرنے کے لیے اس کے مخالفین پوری طاقت کے ساتھ ہم چلا رہے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ بسا اوقات دل میں یہ سوال پیدا ضرور ہوتا ہے کہ جماعت کے متعلق مولانا کے یہ احساسات کچھ نئے نہیں ہیں بلکہ بہت پرانے ہیں پھر مولانا نے ان کو اس سے پہلے پبلک کے سامنے لانا کیوں نہیں پسند فرمایا؟ اس فتنہ کے زمانہ ہی کو اس کے لیے کیوں انتخاب فرمایا؟ پھر مولانا جیسے اصلاح پسند آدمی سے یہ توقع بھی کچھ بیجا نہیں تھی کہ ایک خادمِ دین جماعت کے خلاف پبلک میں رائے زنی کرنے سے پہلے وہ اس کے ذمہ دارین سے تبادلہ خیال اور اصلاح حال کی کوشش کرتے۔ ہمارے اور ان کے درمیان اگر ملاقات کی راہ مسدود تھی تو مراسلت کی راہ مسدود نہیں تھی۔ جماعت کے اندر مولانا کے ایسے نیاز مند بھی موجود تھے جن کو مولانا شرفِ مراسلت سے وقتاً فوقتاً مشرف فرماتے رہے ہیں، بڑی آسانی سے وہ اپنے یہ احسانات اور یہ مشورے ان کو بھیج کر ان کی بابت جماعت کا ردِ عمل معلوم کر سکتے تھے۔ لیکن ان تمام باتوں میں سے کسی بات کو بھی مولانا نے پسند نہیں فرمایا۔ حالانکہ مصلحتِ اسلام و مسلمین کے نقطہ نظر سے یہ دونوں

ان شاء اللہ زیادہ موزون ثابت ہوں گی۔ تاہم جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، مجھے اس بات کی کوئی شکایت نہیں ہے کہ جماعت کے خلاف اس ہنگامہ کے زمانہ میں مولانا نے یہ مضمون کیوں لکھا ہے۔ مولانا کے احساسات کا پسلبک میں آجانا ضروری تھا، کچھ مضائقہ نہیں اگر ہمارے نقطہ نظر سے یہ مضمون نامناسب زمانہ میں لکھا گیا۔ اگر ہمارے مخالفین اس سے ہمارے خلاف اپنی ہنگامہ آرائیوں میں مدد دے سکتے ہیں تو ہم بھی اس کو بہت سی کہنہ غلط فہمیوں کے ازالہ کا واسطہ بنا سکتے ہیں اور مولانا ان شاء اللہ دونوں ہی پہلوؤں سے تعاون علی الخیر کے اجر کے مستحق ٹھہریں گے۔

اب میں مولانا کے احساسات میں سے ایک ایک احساس کا تجزیہ کر کے اس کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

(۱)

پہلی بات جو مولانا فرماتے ہیں وہ یہ ہے کہ:-

”آپ حضرات کی دعوت اور دعویٰ تو اس کام کا ہے جس کے لیے انبیاء علیہم السلام آتے تھے لیکن اس کے لیے تنقیدی ٹریجر، جماعتی تنظیم اور عملی جدوجہد کی مختلف شکلوں میں جو کچھ ہو رہا ہے ذرا گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ آپنے اس کے لیے طرہی کار بہت کچھ مستعار لیا ہے آج کل کی مادی تحریکیوں سے“

جماعت پر مولانا کا یہ الزام نمبر ایک ہے، اور اس پر غور کیجیے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ یہ الزام اچھا خاصہ سنگین بھی ہے لیکن لطف یہ ہے کہ اس پہلے ہی الزام کے بلے میں مولانا پوری طرح مطمئن نہیں ہیں کہ یہ جو کچھ وہ محسوس کر رہے ہیں فی الواقع اس کے لیے کوئی وجہ بھی ہے یا انہوں نے یوں ہی محسوس کر لیا ہے۔ وہ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ ”خود میرا اس بارہ میں کوئی متعین اور واضح احساس نہیں ہے جس پر مجھے اطمینان ہو“ البتہ ”بعض اہل بصیرت“ نے جنہوں نے جماعت کا ”ٹریجر“ کچھ ”پڑھا ہے“ مولانا کے سامنے یہ اظہار خیال کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور اس کے اصل مقصد کے سمجھنے میں جماعت اسلامی واسطے جو حائل کیے گئے ہیں ان سے کچھ مبالغہ نظر آتا ہے۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ مولانا نے ایک واضح مسئلہ میں دوسرے ”اہل بصیرت“ سے، ایک جماعت کے بارے میں، کوئی احساس مستعار لینے کی ضرورت کیوں محسوس فرمائی؟ وہ خود صاحب علم ہیں، جماعت کے ٹریچر پر ایک نگاہ ڈال کر خود اندازہ کرے سکتے تھے کہ کس جگہ انبیاء کی دعوت یا اس کے مقصد کے سمجھنے میں ہم دورِ حاضر کی مادیت سے متاثر ہوئے ہیں۔ اگر مولانا وقت کی مادی تحریکوں سے بے خبر تھے تو اسلام سے تو بے خبر نہیں تھے، وہ اتنا تو اندازہ بہر حال کر ہی سکتے تھے کہ کہاں کہاں انبیاء کی دعوت اور اس کے اصل مقصد کو گمیش کرنے میں غلطیاں کی گئی ہیں۔ اس کام کے لیے کچھ ضروری نہیں تھا کہ مولانا جماعت اسلامی کا ”الماری بھر دینے والا“ پورا لٹریچر کھنگالتے۔ بلکہ اگر وہ میری صرف ایک کتاب ”دعوتِ دین اور اس کا طوق کا“ (جو حال ہی میں چھپ کر شائع ہوئی ہے) پڑھ لیتے تو ان کے سامنے ہمارا موقف پوری طرح واضح ہو جاتا کہ ہم نے انبیاء کی دعوت اور اس کے مقصد کو قرآن و حدیث سے معین کیا ہے یا وقت کی مادی تحریکوں سے؟

اگر مولانا نے اس معاملہ میں دوسروں کا احساس مستعار لینے کی ضرورت اس لیے محسوس کی کہ وہ خود وقت کی مادیت اور مادی تحریکوں سے براہِ راست واقف نہیں ہیں، تو میں اس بات پر تو ان کو ضرور دو دوں گا کہ انہوں نے جس پہلو سے اپنے اندر کمی محسوس کی، دوسروں کی مدد سے اس کی تلافی کی کوشش فرمائی، لیکن ساتھ میں ان کو اس امر واقعہ سے بھی آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے ”اہل بصیرت“ رہنماؤں نے ان کی بڑی غلط رہنمائی کی ہے۔ اور اس کی وہ بھی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو انہوں نے دیدہ و دانستہ، مولانا کی کسی سے فائدہ اٹھا کر ان کو جماعت اور جماعت کے ٹریچر سے بدگمان کرنا چاہا ہے۔ یا پھر اسلام اور وقت کی مادیت اور مادی تحریکات ہر چیز سے وہ خود بالکل نااہل ہیں اور انہوں نے مولانا کے سن اعتماد کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کو اندھے راہ دکھانے والوں کی طرح بالکل غلط راہ دکھائی ہے۔ اور پھر ان سے بڑی غلطی تو مولانا کی ہے کہ اس فحاش کے لوگوں نے جو کچھ کہہ دیا اس کو انہوں نے صرف باور ہی نہیں کر لیا بلکہ بے تکلف جماعت اسلامی کی نہرست جرائم میں اس کو جرم نمبر ۱ کی حیثیت سے درج بھی فرما دیا اور حضرت رسول کریم صلعم کی وہ بات ان کو یاد نہ آئی کہ کفٰی بالمرء کذباً ان

یحدت، یکل، مانسجم۔ انہیں اپنے راویوں سے پوچھنا چاہیے تھا کہ جماعت اسلامی نے ان مادی تحریکوں سے کیا چیز لی ہے؟ عقائد اور نظریات اور اصول۔ ایسے ہیں، یا وسائل اور تدابیر؟ اگر وہ کہتے کہ پہلی چیز لی ہے تو اس کی کم از کم کوئی ایک ہی نظیر ان سے دریافت کی جانی چاہیے تھی۔ اور اگر وہ کہتے کہ دوسری چیز لی ہے تو پھر پوچھنا چاہیے تھا کہ اس میں سے جو کچھ زیادہ ہے وہ مباعات کے قبیل سے ہے یا مکروہات و محظورات، کے قبیل سے؟ اگر مباعات، میں سے ہے تو ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوئی چیز دوسروں سے لینا کوئی جرم نہیں ہے۔ اور اگر ممنوعات میں سے ہے تو وہ بے شک جرم ہے۔ مگر اس کا کوئی ثبوت ہونا چاہیے کہ جماعت اسلامی نے ایسی کوئی چیز دوسروں سے اخذ کی ہے۔ یہ کوئی تقویٰ نہیں ہے کہ بغیر کسی تحقیق اور تشخیص کے محض ایک، ہوائی الزام دوسروں پر چسپاں کر دیا جائے۔ مولانا اور ان کے اہل بصیرت مشیروں کے نزدیک جماعت اسلامی اور اس کی جدوجہد وقت کی جن مادی تحریکوں سے متاثر ہے ان میں سے نام لے کر مولانا نے صرف اشتراکیت کا ذکر کیا ہے۔ اس لیے میں بھی اسی کو بحث کے لیے انتخاب کرتا ہوں اور اس کی بعض نمایاں خصوصیات کا حوالہ دے کر مولانا سے یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ ان میں سے کون کون سی خصوصیات وہ جماعت اسلامی کے اندر پا رہے ہیں۔

اشتراکیت کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا سارا فلسفہ پیٹ کے محور پر گھومتا ہے۔ اسی سے اشتراکیوں کے ہاں تاریخ بنتی ہے۔ اسی سے فلسفہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے نظریہ ہائے حیات جنم لیتے ہیں اور یہی تمام اقدار و اخلاق کا سرچشمہ ہے۔ کیا فی الواقع مولانا کے نزدیک جماعت اسلامی کی تمام سرگرمیوں کا محور بھی یہ پیٹ ہی ہے اور خدا، رسول اور اسلام کا نام وہ محض عوام فربہ کے لیے استعمال کر رہی ہے؟

اشتراکیت کی دوسری انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی عملی تدبیروں میں طبقاتی جنگ کے زیادہ مؤثر حصہ ہے۔ وہ ناداروں کو سرمایہ داروں کے خلاف بھڑکاتی ہے اور جب وہ پوری طرح بھڑک جاتے ہیں تو دونوں میں جنگ برپا کر کے نسل امتداد گزہ کو صفحہ ہستی سے محو کر دیتی

ہے۔ کیا مولانا ایمان داری کے ساتھ فرما سکتے ہیں کہ جماعت اسلامی بھی اپنی حدود
جہد میں اسی طبقاتی جنگ کے حربہ سے کام لے رہی ہے؟

اشتراکیت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی عملی سرگرمیوں میں بیشتر خفیہ طریقوں اور
تخریبی اقدامات پر اعتماد کرتی ہے۔ کیا مولانا کے علم میں کوئی ایک
بات بھی ایسی ہے جس کی بنا پر وہ دعویٰ کر سکتے ہوں کہ جماعت اسلامی بھی اپنی عملی سرگرمیوں میں
خفیہ طریقوں اور تخریبی اقدامات پر کسی درجہ میں بھی سہی، اعتماد کرتی ہے؟

اشتراک کی ادب کی مقبولیت کا سارا راز اس کی فحاشی، اس کی عریان نگاری، اور فریڈ کی
جنسیات پرستی میں پوشیدہ ہے۔ اشتراک کی اہل قلم پہلے اسی متاع فاسد کو لے کر عوام میں گھستے
ہیں اور جب ان چیزوں کی کشش سے سادہ لوح اور جاہل عوام اور جنسیات کے بھوکے نوجوانوں
کو اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں تو پھر آہستہ آہستہ ان کے اندر مارکس اور فریڈ کے معاشی اور اخلاقی
نظریات بھی اتار دیتے ہیں۔ کیا مولانا فرما سکتے ہیں کہ جماعت اسلامی بھی
انہی حربوں سے کام لے کر اپنے ادب کو مقبول بنانے کی کوشش کر رہی ہے؟ اور جماعت
اسلامی کا "الماری بھر دینے والا ٹریکچر" انہی چیزوں پر مشتمل ہے؟

میں نہیں کہہ سکتا کہ ان چیزوں میں سے کسی چیز کے کسی ادنیٰ شائبہ کی بھی جماعت اسلامی کے
کسی گوشہ میں نشان دہی کی جاسکتی ہو۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ مولانا اور ان کے "اہل بصیرت" مشرین
نے آخر کس قدر مشترک کی بنا پر جماعت اسلامی اور اشتراکیت کے درمیان تہمت جوڑا ہے۔ کیا انکار
خدا اور انکار آخرت دونوں کے درمیان مشترک ہے؟ کیا جنسی انار کی اور باحیثیت میں دونوں کا
نقطہ نظر ایک ہے؟ کیا اخلاقی اقدار کی نفی میں دونوں ہم مذہب ہیں؟ کیا ملکیت ذاتی کے
ابطال میں دونوں ہم عنان ہیں؟ آخر وہ کدو کی سی چھوٹی یا بڑی، ظاہری یا باطنی، مادی یا روحانی
نسبت ہے جو دونوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے اور جس کی بنا پر دونوں کا رشتہ جوڑا جاسکتا
ہے؟ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے تو پھر اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ

مولانا اور ان کے اہل بصیرت زعماء "یا تو جماعت سے واقف نہیں ہیں، یا اشتراکیت سے واقف نہیں ہیں، یا ان دونوں ہی سے بالکل بے خبر ہیں۔"

مولانا نے جماعت اسلامی اور اشتراکیت کے درمیان جو ملاپ کے لیے جو باتیں بطور دلیل بیان کی ہیں نامناسب نہ ہوگا اگر مختصر ان کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔

مولانا کی پہلی دلیل یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی سرگرمیوں میں فکر آخرت کی اندس ناک حرکت کی گئی ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ جماعت اسلامی میں تزکیہ اخلاق اور تہذیب نفس کا کام کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے بعض اخبارات اپنے مخالفوں کو بدنام کرنے کے لیے وہ سارے غلط طریقے استعمال کرتے ہیں جو باؤدی تحریکوں کے حامی پارٹی باز کیا کرتے ہیں۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے ایک رکن نے جس کا پتہ نشان انہوں نے کچھ نہیں دیا (مولانا کو یہ خبر دی ہے کہ جماعت اسلامی کے ٹریچر میں کمیونسٹوں کی مثال کو اس کثرت سے دہرایا گیا ہے کہ انہی کا طرز عمل ارکان جماعت کے لیے "اسوہ حسنہ بن گیا ہے۔"

مجھے بالترتیب مولانا کے ان قیمتی دلائل کا جائزہ دینا ہے۔

مولانا کو جماعت اسلامی کے کاموں میں فکر آخرت کی جو کمی محسوس ہوئی ہے اس کی اصل وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان فکر آخرت کا تصور ہی مختلف ہے۔ ایک خاص طرز کے ماحول میں رہنے بسنے کی وجہ سے ان کے ذہن نے فکر آخرت کو ایک مخصوص مسئلہ کے ساتھ بانڈھ دیا ہے، اس وجہ سے وہ صرف اسی فکر آخرت کو فکر آخرت سمجھتے ہیں جس کا نظریہ ان کی جانی پہچانی معتاد صورتوں میں ہو۔ لیکن اگر وہی چیز دوسری صورتوں میں جلوہ گاہ ہو، یا غیر محدود پہلے پر پوری زندگی کی دستغوب میں پھیل گئی ہو تو مولانا اور ان کی طرح سوچنے والے دوسرے

لوگ وہاں کسی فکرِ آخرت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس ہم فکرِ آخرت کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی کے دل میں خدا کے حضور اپنی ذمہ داری و مسئولیت کا، اور دنیا پر آخرت کی ترجیح کا خیال ابھر اُجم جائے اور اس خیال کے اثر سے اس کی پوری زندگی ایک ذمہ دارانہ زندگی بن جائے، نقطہ نظر اس سے کہ وہ زندگی کسی خانقاہ یا دارالعلوم میں بسر ہو رہی ہو یا کسی کالج یا کسی تجارتی منڈی، یا کسی فیکٹری میں۔ ہم جہاں بھی حدودِ اللہ کی پابندی، فرائض کی ادائیگی، حرام سے اجتناب، منکر سے نفرت اور معروف سے لگاؤ پاتے ہیں، وہاں ہم کو خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کی موجودگی کا یقین ہو جاتا ہے۔ بلکہ جہاں معصیت کے مواقع سب سے زیادہ اور لغزش قدم کے امکانات سب سے بڑھ کر ہیں وہاں حدود کی پابندی میں ہم کو فکرِ آخرت کا جلوہ سب سے زیادہ نظر آتا ہے خواہ ایسا شخص بالکل سیدھی سادھی دنیا داروں کی سی زندگی بسر کر رہا ہو اور فنِ دیداری کے نقطہ نظر سے اس کا شمار بالکل انائیوں ہی میں کیوں نہ ہوتا ہو۔

ہمارے اور مولانا کے تصورِ فکرِ آخرت کا ایک اور اہم اختلاف یہ بھی ہے کہ وہ انسان کی زندگی کے کسی ایک گوشہ میں تنویر پیدا کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ یہ زندگی فکرِ آخرت کے نور سے جگمگا اُٹھی ہے، اگرچہ اس زندگی کے دوسرے گوشوں میں جاہلیت کی کشتی ہی گندگیاں اور آلودگیاں موجود ہوں۔ لیکن ہم زندگی کو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اس لیے جب تک کسی شخص کی زندگی بحیثیت مجموعی حدودِ اللہ کے اندر نہ آجائے اس وقت تک ہم فکرِ آخرت کے نقطہ نظر سے اس کو ناقص سمجھتے ہیں۔ اس اختلاف کے سبب اگرچہ ہمارا حاصل مولانا کے حاصل سے زیادہ ہو لیکن نمائش کے نقطہ نظر سے ہم خسارہ میں رہیں گے۔ کیونکہ دیکھنے والوں کو وہ تقویٰ جو زندگی کے تمام وسیع اطراف میں پھیلا ہوا ہے اُس تقویٰ کے مقابل میں بہر حال کم نظر آئے گا جو زندگی کے کسی ایک ہی گوشہ میں مرکوز کر دیا گیا ہو۔

ہمارے اور مولانا کے تصور میں ایک اختلاف اس پہلو سے بھی ہے کہ وہ فکرِ آخرت کا مشاہدہ صرف صوفیانہ طرز کے اذکار و اشغال ہی میں کرتے کے نوکر ہیں۔ جہاں یہ چیز نہ پائی جائے۔

وہ سمجھتے ہیں کہ بھلا یہاں فکر آخرت کا کیا کام؟ اور ہم اس فکر آخرت کا مشاہدہ ان سرگرمیوں میں کرنے کے عادی ہیں جو ایک آدمی اللہ کے دین کو اپنے اوپر اور اپنے ماحول کے اوپر قائم کرنے میں صرف کرتا ہے۔ ہم اُس حیمیت میں اس چیز کو ڈھونڈتے ہیں جو اس کے اندر اللہ کے دین اور اس کے احکام کی پامالی کو دیکھ کر اُبھرتی ہے۔ اُس غیرت اور بے چینی میں اس کو تلاش کرتے ہیں جو ایک مسلمان کے اندر فسق و فجور کے موجودہ ہنگاموں کو دیکھ کر پیدا ہونی چاہیے۔ اُس کرب اور اُس غم میں اس کو دیکھتے ہیں جس میں ایک بندہ حق خلق خدا کی گمراہیوں کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ ان پہلوؤں سے جب ہم اپنے رفیقوں کو اور خود اپنے آپ کو دیکھتے ہیں تو ہم ان میں بھی اور اپنے آپ میں بھی بُری کیاں پاتے ہیں۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی غم عشق ہم پر اتنا غالب نہیں آیا ہے کہ غم روزگار کو بالکل ہی بھلا دے۔ تاہم اگر مولانا جماعت اسلامی کو سمجھنا چاہتے ہیں اور فکر آخرت کے نقطہ نظر سے اس کا حال معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ان کو دعوت دینا ہوں کہ وہ ایک ایک رکن جماعت سے بلکہ متاثرین جماعت تک سے پوچھیں کہ پہلے اُن کی زندگی کیا تھی اور اب کیا ہے؟ پہلے وہ حلال و حرام میں عملاً کتنی تمیز کرتے تھے اور اب کس قدر کرتے ہیں؟ پہلے احکام شرعیہ کی کتنی پابندی کرتے تھے اور اب کتنی کرتے ہیں؟ پہلے اپنے معاملات میں اخلاقی حدود کا کتنا لحاظ کرتے تھے اور اب کتنا کرتے ہیں؟ پہلے دین و ایمان کے تقاضوں کو کتنا سمجھتے اور پورا کرتے تھے اور اب کتنا سمجھتے اور پورا کرتے ہیں؟ پہلے اسلام اور جاہلیت کے فرق کی باریکیوں تک اُن کی نگاہ کہاں تک پہنچتی تھی اور اب کہاں تک پہنچتی ہے؟ پہلے کفر و فسق کے تسلط سے اُن کے دل کی گڑھن کا کیا حال تھا اور اب کیا حال ہے؟ پہلے اُن کی دین کی خواہش اور کوشش ان کی زندگی میں کیا مقام رکھتی تھی اور اب کیا رکھتی ہے؟ یہ سوالات مولانا صرف انہی لوگوں سے نہ کریں جو مغربیت زدہ طبقے میں سے نکل کر جماعت کی طرف آئے ہیں، بلکہ اُن لوگوں سے بھی کریں جو پہلے مولویوں اور صوفیوں اور دیندار گروہوں میں شامل تھے اگر ان سوالات کا یہ جواب ملے کہ فی الواقع ان کے اندر ان حیثیات سے بڑا فرق ہو گیا ہے

تو پھر مولانا ان سے یہ بھی پوچھیں کہ آیا ان کے اندر یہ فرق کسی دنیوی لالچ یا کسی دنیوی خوف سے ہوا ہے یا اس کی وجہ خدا کی خدائی پر ایمان اور آخرت اور آخرت کی جواب دہی کا احساس ہے مجھے اُمید ہے کہ ان سوالوں کے جواب سے مولانا کی بدگمانی بہت بڑی حد تک دور ہو جائے گی۔ اور کیا بعید ہے کہ اس کے بعد اپنی جماعت اور جماعت اسلامی کا فرق بھی کچھ ان کی سمجھ میں آجائے۔ اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی لائق غور ہے۔ اس جماعت میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے کاروبار صرف اس لیے بیٹھ گئے ہیں یا ماند پڑ گئے ہیں کہ وہ حرام اور مشکوک طریقوں کو اختیار نہیں کرتے۔ متعدد لوگ ایسے ہیں جنہوں نے بار بار اپنے رزق کے ایک راستہ کو چھوڑ کر دوسرا اختیار کیا ہے اور اس میں نقصانات اٹھائے ہیں، صرف اس لیے کہ وہ رزق حلال کے طالب ہیں۔ متعدد لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اچھی خاصی ملازمتیں صرف اس لیے چھوڑ دیں کہ یا تو ان ملازمتوں میں وہ حرام کمانے پر مجبور ہوتے تھے یا ان کو اقامتِ دین کی سعی سے دستبردار ہونا پڑتا تھا۔ متعدد لوگ ایسے ہیں جو اپنی زندگی میں کسی طریقے پر عامل تھے اور جو نبی انہیں معلوم ہوا کہ یہ شریعت کے خلاف ہے انہوں نے اسے چھوڑ دیا اور کسی نقصان یا تکلیف کی پروا نہ کی۔ متعدد لوگ ایسے ہیں جو اپنے خاندان میں منطعون ہوئے، اپنے دوستوں اور عزیزوں سے چھوٹے اپنی برادری اور رشتہ میں تسلسلے گئے، حتیٰ کہ اپنی جدی میراثوں تک سے محروم ہوئے، صرف اس لیے کہ وہ ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے تھے اور جن لوگوں سے ان کی زندگی وابستہ تھی وہ ان کے اس رویہ کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ پھر یہ منظر ابھی حال ہی میں لوگوں کی نگاہوں سے گزر چکا ہے کہ پنجاب کے انتخابات میں جماعت نے تقریباً تین چار ہزار نئے اور پرانے کارکنوں کو استعمال کیا اور گنتی کے چند آدمیوں کو چھوڑ کر یہ سب کے سب، جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں، انتخاب کے اس پوزے ہنگامے میں شریعت اور اخلاق کے حدود پر قائم رہے۔ انہوں نے اپنی مالی قربانیوں اور اپنی محنتوں کو اپنے سامنے برباد ہوتے دیکھا لیکن ایک سیٹ بھی ناجائز طریقوں سے حاصل کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کے سامنے ہر طرح کے

لاپچ بھی آئے اور دھمکیاں بھی آئیں مگر وہ سیدھے راستہ سے نہ چمٹے۔ ان کے خلاف ہر طرح کے جھوٹ بولے گئے، مگر ان کی زبان جھوٹ سے آلودہ نہ ہوئی۔ ان کو برسرِ بازار منہ در منہ گالیاں دی گئیں، مگر انہوں نے کبھی گالی کا جواب گالی سے نہ دیا۔ حالانکہ یہ انتخابات وہ چیز ہیں جس کے میدان میں اگر عام دنیا دار ہی نہیں بڑے بڑے مولوی اور صدیقی اور خانقاہی تزکیہ نفس کے فارغ التحصیل بھی تقویٰ کے حدود پر قائم نہیں رہ سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ اگر خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب اور آخرت کی جواب دہی کی وجہ سے نہیں ہے تو اس کی تہ میں اور کس محرک کی نشان دہی کی جاسکتی ہے؟ اگر اس پورے طرزِ عمل کا محرک ایمان باللہ و بالیوم الآخر ہی بنے تو پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ کیا فکر آخرت ہے جس کی کمی مولانا کو جماعت اسلامی میں افسوسناک حد تک نظر آرہی ہے؟ کیا مولانا کا مطلب یہ ہے کہ جماعت بھی انہی مکاریوں میں مبتلا ہو جائے جن میں بہت سے دینداری کی فائش کرنے والے لوگ مبتلا ہیں کہ زبان پر تو ہر وقت خدا اور آخرت کا ذکر ہو اور لفظا ہر خوب رونے وھونے کی مشق کی جائے مگر معاملات اور زندگی بھر کے طرزِ عمل میں اس ذکر و سوز کا کوئی اثر نہ پایا جائے۔

مولانا کی دوسری دلیل بھی نہایت غلط اور جماعت کے حالات سے بے خبری پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے یہاں تزکیہ نفس اور تہذیب اخلاق کا کام اہل تصوف کے طریقہ پر نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمارے یہاں تزکیہ نفس کا کام سرے سے ہو ہی نہیں رہا ہے۔ ہم اہل تصوف کے طریقہ کو صحیح نہیں سمجھتے، اس لیے ہم نے اس کو اختیار نہیں کیا ہمارا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ اُس سے نفس کا جتنا تزکیہ ہوتا ہے اس سے زیادہ اس کے اندر خرابیاں ابھر آتی ہیں۔ اس لیے ہم نے اس کا وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو ہم نے کتاب و سنت کے موافق پایا۔

لے ممکن ہے مولانا محض منظور صاحب کو اب یاد نہ رہا ہو، مگر ہم انہیں یاد دلاتے ہیں کہ وہ خود ایک مرتبہ اپنا ذاتی تجربہ جائے سامنے بیان کر چکے ہیں کہ انتخابات کے میدان میں اگر ان کے اپنے گروہ کے عمائد اور صلحاء

اس طریقہ کی تفصیلات بتانا تو اس وقت میرے لیے مشکل ہے لیکن چند باتوں کی طرف برسپیل تذکرہ اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

اس سلسلہ میں ہم نے پہلا کام تو یہ کیا ہے کہ قرآن شریف سے وہ چیزیں چھانٹ لی ہیں جو خاص طور پر تزکیہ نفس اور تہذیب اخلاق کے مختلف پہلوؤں سے متعلق رکھتی ہیں۔ اسی طرح احادیث نبوی کے وسیع ذخیرہ میں جو چیزیں تزکیہ نفس اور تہذیب اخلاق سے متعلق ہیں وہ بھی منتخب کر لی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس احسان کے جو اصول و مبادی قرآن و حدیث سے مستنبط ہوتے ہیں وہ بھی ہم نے مرتب کر ڈالے ہیں۔ پھر جماعت کے ٹریمپ میں سے ہم نے وہ چیزیں نشان زد کر دی ہیں جو پہلے اصلی مقصد کی طرف براہ راست رہنمائی کرتی ہیں۔ اور اپنے تمام ارکان کے لیے یہ مزدوری قرار دے دیا ہے کہ وہ سال میں کم از کم ایک مرتبہ اس کورس سے کسی قابل اعتماد نگران کی نگرانی میں ضرور گذر جایا کریں۔ جماعتی طور پر اس بات کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ ارکان کا محاسبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں حدود اللہ کی محافظت کے عادی نہیں اور اگر ان سے کوئی خلاف درزی صادر ہو جائے تو تشریعت کی ہدایات کی روشنی میں اس کی تلافی کی کوشش کریں۔

یہ ساری باتیں ہم نے تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس ہی کی غرض سے اختیار کی ہیں مگر مولانا کو ان باتوں کی اطلاع نہیں ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دنیا میں کوئی کام ہو ہی نہیں رہا ہے۔ کام سے زیادہ اس کا وھنڈوڑا پینا، اور وہ بھی تزکیہ و تقویٰ کا وھنڈوڑا، یہ ہمارا طریقہ نہیں ہے۔

جماعت سے تعلق رکھنے والے اخبارات پر یہ الزام کہ وہ اپنے مخالفوں کو بدنام کرنے کے لیے وہی سائے طریقے استعمال کر رہے ہیں جو مادی تحریکوں کے حامی ”پارٹی باز“ کیا کرتے ہیں، میرے نزدیک صریح بہتان ہے۔ ممکن ہے کہ مولانا کو ان جو بات کی چوٹ لگی ہو جو حال میں ان کے گردہ کے اکابر کی فتویٰ بازی کے مقابلے میں جماعت کے اہل قلم کی طرف سے دیے گئے ہیں۔ لیکن اگر مولانا اگر دسی عصبیت سے کام نہ لیں بلکہ عدل و قسط کے ساتھ حلوں اور ان کے

جوابات کا موازنہ فرمائیں تو ان کا اپنا دل گرہی دیکھا کہ ظلم دوسری طرف سے ہوا تھا اور جماعت اسلامی کے لوگوں نے اس کا جو کچھ بھی جواب دیا وہ قرآن مجید کی تباہی ہوئی حدود کے اندر رہتے ہوئے دیا۔ مولانا ہمارے کسی ایک لفظ یا فقرے کی نشان دہی بھی نہیں کر سکتے جو حق سے متجاوز ہو۔ مگر ہم ان کے گردہ کے اکابر کی عبارتیں کی عبارتیں ایسی پیش کر سکتے ہیں جو اخلاق اور دیانت کی حدود سے صریحاً متجاوز ہیں۔

لیکن اگر مولانا اس تازہ چرچ سے متاثر نہیں ہیں بلکہ ان کی شکایت جماعت کے اخبارات و رسائل کی عام روش سے متعلق ہے تو میں عرض کروں گا کہ ہمارے کسی اخبار یا رسالہ کو مادی تحریکوں کے پارٹی باز اخباروں کی صف میں رکھ دینا شان احتیاط و تقویٰ سے بہت بعید ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بسا اوقات ہمارے فوجان کھنے والوں کے قلم سے، ایسے فقرے نکل گئے ہیں جو جماعت کے مزاج کے خلاف تھے لیکن ان کے خلاف سب سے زیادہ آواز خود جماعت کے ارکان نے اٹھائی ہے۔ ہماری مجلس شوریٰ کا کوئی جلسہ نہیں ہوتا جس میں جماعت سے تعلق رکھنے والے اخبارات و رسائل کی تحریریں زیر بحث نہ آتی ہوں اور ہم جن باتوں کو ذرا بھی انصاف اور راست بازی کے خلاف پاتے ہوں ان کو روکنے کی کوشش نہ کرتے ہوں۔ ترجمان القرآن نے معیار بھی ایسا بلند قائم کر دیا ہے کہ ہر قسم کا اخبار یا رسالہ جماعت میں مقبول نہیں ہو سکتا۔ جو اخبارات راہ اعتدال اور مناسبت سے بٹ کر چلتے ہیں جماعت کا مزاج خود بخود ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

اسلامی اصولوں کی پابندی نے جماعت سے تعلق رکھنے والے اخبارات کو مادی اعتبار سے جو نقصان پہنچایا ہے ہمارے بے رحم نقادوں کو شاید اس کی خبر نہیں ہے۔ ملک نصر اللہ خان صاحب عزیز طرز جدید کے چوٹی کے اخبار نویسوں میں تھے اور اگر مذاقِ محال کا لحاظ کر کے وہ کوئی اخبار لکھتے تو شاید اس ملک میں ان کا اخبار اول درجہ کے کثیر الاشاعت اخباروں میں ہوتا۔ لیکن جماعت نے ان کے اخبار کو ایسا بے مرجع و ملک کر کے رکھ دیا ہے کہ اسی کو باغیغیت سمجھا جا رہا ہے کہ کوثر نکل رہا ہے۔ اسی طرح نعم صدیقی صاحب کے قلم میں خدا نے اتنی طاقت دی ہے کہ اگر

وہ فی الواقع ”پارٹی باز“ اخبار نویسوں کی طرح لوگوں کی پکڑیاں اچھلنے پر آجاتے تو ایک دنیا ان سے پناہ مانگتی۔ لیکن اللہ نے ان کو توفیق بخشی کہ وہ ایک نیک کام میں لگ گئے اور اب حال یہ ہے کہ اس غریب کو اپنے ایک ایک فقرہ کا آخرت سے پہلے دنیا ہی میں حساب دینا پڑتا ہے۔

ح ایک ایک فقرہ کا مجھے دینا پڑا حساب

خون جگر و دینیت فرکان یار تھا

اور انہی جماعتی اور اخلاقی پابندیوں کا یہ اثر ہے کہ ”چراغِ راہ“ ہمیشہ ٹھٹھاتا ہی رہتا ہے اگر اس کا ایڈیٹر پارٹی باز اخبار نویسوں کی طرح بے نظام ہوتا تو شاید اس فساد مذاق کے زمانہ میں وہ اپنے قلم کی سب سے زیادہ قیمت وصول کر سکتا۔

بہر حال مولانا نے جماعت سے تعلق رکھنے والے اخبارات و رسائل پر یہ الزام بہت ہی غلط لگایا ہے۔ میں مولانا کو پہلے چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اس کا کوئی ثبوت پیش کریں اور پھر انہی کو حکم بھی مانتا ہوں کہ وہی فیصلہ بھی کریں کہ کیا فی الواقع ان کا یہ الزام صحیح ہے؟ کیا واقعہ کوثر ترجمان القرآن، چراغِ راہ اور جہانِ نو اسی قسم کے پرچے ہیں جیسے اس ملک میں دوسرے اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں؟ اگر مولانا اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتے تو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ صریح ہتیان لکھتے وقت خود ان کی اپنی فکر آخرت کو کیا ہو گیا تھا؟

مولانا کی چوتھی دلیل بھی نہایت ضعیف ہے۔ جماعت کے ٹریجر میں کمیونسٹوں کی مثال ہلٹی ضرور گئی ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ کسی ایک جگہ بھی یہ مثال جماعت کے کارکنوں کے سامنے اتباع اور ”اسوہ حسنہ“ بنانے کے لیے رکھی گئی ہو۔ یہ مثال تو ہماری ٹریجر میں جہاں بھی پیش کی گئی ہے عبرت پذیر ہی کے لیے پیش کی گئی ہے کہ اشتراکی ایک غلط نظام زندگی کو دنیا پر غالب کرنے کے لیے اس خرم و نہمت کے ساتھ کام کر رہے ہیں کہ ان کے ذہن میں کبھی یہ خطرہ بھی نہیں گذرتا کہ ہم ناکام ہونگے اور جہاں حال یہ ہے کہ ہم ایک خدائی نظام زندگی رکھتے ہوئے بھی سہمے جا رہے ہیں کہ جہلا موجودہ دنیا میں یہ کس طرح قائم ہو سکے گا؟ اگر کسی رکن جماعت نے اس مثال کو، جو

عبرت حاصل کرنے کے لیے پیش کی گئی تھی، یہ سمجھ دیا کہ ”اسوہ حسنہ“ بنانے کے لیے پیش کی گئی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے بڑی سخت بلا دیت ذہن کا ثبوت دیا ہے اور مولانا کو چاہیے تھا کہ ان کو ڈوکتے کہ خدا کے بندے یہ مثال عبرت حاصل کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے نہ کہ اسوہ حسنہ بنانے کے لیے!۔ لیکن مولانا نے کمال کیا کہ ایک بلید الذہن آدمی کی ایک احتفانہ بات کو ایک نکتہ معرفت سمجھ کر نوٹ کر دیا اور جماعت کی فہرست جرائم میں اس کو بھی سجا کر رکھ دیا۔

میں مولانا سے نہایت ادب سے یہ عرض کرتا ہوں کہ قرآن مجید میں شیطان کے اغوا کی مثال کئی جگہ دہرائی گئی ہے۔ اب فرض کیجیے کہ تبلیغی جماعت کا ایک کارکن مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ قرآن میں شیطان کے اغوا کی مثالیں اتنی کثرت سے دہرائی گئی ہیں کہ میرے لیے اسی سخت کا طریقہ ”اسوہ حسنہ“ بن گیا ہے اور ہمارے اکثر رفیق اب اسی طریقہ پر کام کرنا چاہتے ہیں تو مولانا اس کو کیا جواب دیتے؟ یہی تو کہتے کہ خدا کے بندے یہ مثال عبرت پذیری کے لیے ہے ”اسوہ حسنہ“ بنانے کے لیے نہیں ہے۔ آخر یہی جواب مولانا ہمارے ان رکن جماعت کو کیوں نہیں دے دیا؟

یہ بات میں اس مغلضہ پر کھ دیا ہوں کہ فی الواقع جماعت میں ایسا کوئی جاہل رکن موجود ہے اور یہ اسی کا قول ہے جسے مولانا نے نقل فرمایا ہے۔ اگرچہ جماعت اسلامی میں اس ٹاپ کے آدمی کی موجودگی باور کرنے کے لائق نہیں ہے۔ تاہم اگر یہ واقعہ ہے تو میں اب اس کا بندوبست کرنا چاہتا ہوں کہ جماعت کے اندر ایسے کذ ذہن لوگ کسی طرح نہ داخل ہو سکیں جو داخل تو ہوں تو جماعت اسلامی کے اندر لیکن پیروی کریں کیونٹوں کے ”اسوہ حسنہ“ کی۔

(۳۲)

مولانا کو دوسری شکایت یہ ہے کہ تقلید و اجتہاد کے بارے میں جماعت کے ذمہ داروں کا جو مسلک ہے اگرچہ وہ بجائے خود مولانا کے لیے ناقابل برداشت نہیں ہے لیکن اس کے سبب سے اللہ کا مقدس دین بے علم مجتہدوں کی آراء و افواہ کا غنیمت مشق بن رہا ہے، اور یہ چیز مولانا کے

یہ ناقابلِ برداشت ہے۔

اسی طرح تیسری شکایت یہ ہے کہ بہت سے لوگ جماعت کا ٹریچر ٹرہو کہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ دین کی روح اور اس کے مغز کو پائے ہیں اور اگر کوئی پیچزدہ ذرا بھی اس سے انک پاتے ہیں تو اس پر بڑی بے باکی سے تنقید کرتے ہیں۔

مولانا نے اندراہ عنایت ان دونوں قصوروں سے جماعت کے ذمہ داروں کو ایک تنک بری قرار دیا ہے۔ وہ مانتے ہیں کہ ان غلط فہمیوں کے سد باب کے لیے ٹریچر میں تنبیہات موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جب لوگ غلط فہمیوں میں پڑنے سے باز نہیں آتے تو مولانا یہ ضرورت محسوس فرماتے ہیں کہ ٹریچر پر نظر ثانی کی جائے۔

جہاں تک پہلی شکایت کا تعلق ہے اس کا جواب میں ان کے گروہ کے ایک پیرزادہ صاحب حکیم عبدالرشید محمود صاحب، کو انہی صفحات میں دے چکا ہوں۔ جماعت کے بے علم تو درکنار جماعت کے اہل علم بھی اجتہاد کی ذمہ داریوں سے کتراتے ہیں۔ اور اگر کبھی کسی نے دینی معاملات میں علم کے بغیر کلام کرنے کی جرأت کی ہے تو اس کو نہایت سختی کے ساتھ روکا گیا ہے۔ میں سچائی کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ پچھلے چار پانچ سالوں کے اندر میرے علم میں کوئی ایسی بات نہیں آئی ہے جو مولانا کے الزام کی تصدیق کرتی ہو۔ اگر مولانا کوئی متغین مثال پیش کریں تو اس پر غور کیا جاسکتا ہے اور ہم اس کے سد باب کی ہر کوشش کریں گے۔

لیکن سوال تو یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے اندر کوئی شخص پڑھا لکھا اور دین کو جاننے والا ہے بھی؟ مولانا تو اندراہ عنایت ایک آدم کو شاید کچھ پڑھا لکھا سمجھتے ہوں، لیکن وہ ذرا دیوبند اور مظاہر العلوم کے مفتیان دین سے بھی تو استغناء کر لیں کہ وہ حضرات ہی اس سے اتفاق رکھتے ہیں یا نہیں؟ اس لیے کہ اگر ان کو اس سے اتفاق نہ ہوا تو سوال صرف ٹریچر پر نظر ثانی کا نہیں دتا بلکہ پورے ٹریچر کو دیا برد کر دینے کا پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ مجھے جہاں تک معلوم ہے یہ نت مولانا مودودی کو بھی دین کے معاملہ میں کلام کرنے کا حقدار نہیں سمجھتے۔

تیسری شکایت کے جواب میں گزارش ہے کہ اس معاملہ میں حقیقت سے زیادہ ہمارے مخالفین کے احساس کہتری کو دخل ہے جماعت کے آدمی جب علماء حضرات کے سامنے دین کے وہ بدیہی تقاضے پیش کرتے ہیں جو انہوں نے جماعت کے ٹریجر سے سمجھے ہیں تو ان حضرات کے دل کو سخت چوٹ لگتی ہے کہ یہ دیکھو، یہ ہمیں دین سمجھانے آئے ہیں! اس طرح بات بسا اوقات بڑھتے بڑھتے بڑھ جاتی ہے اور ایسے مسائل زیر بحث آ جاتے ہیں جن سے انہیں یہ بدگمانی ہو جاتی ہے کہ جماعت اسلامی والے اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور دوسروں کو علم سے عاری خیال کرتے ہیں۔ اس کے سد باب کے لیے ابتدا ہی میں ہم نے کارکنوں کو یہ ہدایت دی تھی کہ علماء اور مشایخ کے طبقہ میں وہی لوگ جائیں جو اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اب ہم نے پھر سختی کے ساتھ ہدایات جاری کر دی ہیں کہ ان حضرات کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے مجھے امید ہے کہ اب اس سلسلہ میں لوگ محتاط ہو جائیں گے اور مولانا کی یہ شکایت ان شاء اللہ ٹریجر پر نظر ثانی کے بغیر ہی رفع ہو جائیگی۔

لیکن مولانا سے ایک گزارش ضرور ہے کہ آخر وہی بد دماغی کیمن قابل علاج ہے جو جماعت اسلامی کے ٹریجر کے مطالعہ سے لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہے؟ مولانا اس بد دماغی کی بھی تو خبریں جو مذہبوں سے ہمارے دینی مدرسوں میں پرورش پا رہی ہے کہ نصاب کی چند کتابیں اٹھی سیدھی پڑھ کر ہر شخص اپنے آپ کو دین کا مختار کل سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ ان کتابوں میں دین کا حصہ اس سے زیادہ نہیں ہوتا قینا آٹے میں نمک کا۔

(۴۱)

چوتھا بڑا مفسدہ جس کا مولانا نے جماعت کے اندر پتہ دیا ہے وہ یہ ہے کہ جماعت کا ٹریجر پڑھنے والے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے بعد جسے اسلام میں غیر اسلام کی آمیزش ہوئی، اگرچہ مختلف زمانوں میں اصلاح و تجدید کی کوششیں کی گئیں لیکن کوئی داعی اور کوئی مصلح بھی پورے اسلام کو بے کرکھڑا نہیں ہوا، بلکہ محض جزوی اصلاحات ہی لوگ کرتے رہے اور اس میں بھی ان سے بڑی بڑی غلطیاں ہوئیں۔ ساڑھے تیرہ سو

سال پہلے کے اصلی اور پورے اسلام کو بالکل صحیح طریق پر قائم کرنے کے لیے اب جماعت اسلامی کھڑی ہوئی ہے اور یہی اس کا طفرائے امتیاز ہے۔

مولانا نے یہ نتیجہ مودودی صاحب کی غالباً ان تحریروں سے نکالا ہے جن میں انہوں نے امام غزالی صاحب، مجدد صاحب، اور شاہ صاحب وغیرہ کو مجدد اور مصلح تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بعض فروگزاشتوں پر تنقید بھی کر ڈالی ہے۔ مولانا کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو مجدد اور مصلح مانتے ہو تو پھر ان کی باتوں اور ان کے کاموں میں مین میخ نکالنے کے کیا معنی؟ اور اگر ان کے کاموں میں بھی نقائص موجود تھے تو یہ مجدد کیسے ہوئے؟ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ خلافت راشدہ کے بعد سے تاریخ کے کسی دور میں بھی پورا دین لوگوں کے سامنے نکھر کے آہی نہ سکا۔ کیونکہ دین کے نکھارنے والے تو یہی مجدد دین تھے اور تم ان کے کاموں میں بھی کیڑے ڈالتے ہو۔

مولانا یہ تشبیہ وار کرنے کے بعد پوچھتے ہیں کہ اگر تہارہ موقف فی الواقع یہی ہے تو پھر وہ حدیثیں کہاں گئیں جن میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہیگا اور وہ لوگوں کے پیدا کیے ہوئے بگاڑ کی اصلاح کرتا رہے گا؟

مولانا کا یہ معارضہ بادی النظر میں قوی معلوم ہوتا ہے۔ اس میں تشبیہ نہیں کہ اگر اس امت کے ہر دو میں ایک گروہ کے حق پر قائم رہنے کی خوش خبری موجود ہے تو غیب کا علم تو صرف اللہ کو ہے لیکن دل یہی گواہی دیتا ہے کہ ابن تیمیہ، مجدد صاحب، شاہ صاحب اور اس زمرہ کے دوسرے اکابر ان شاء اللہ ضرور حق پر ہیں اور ان کی خدمات ان شاء اللہ ضرور تجدید دین میں شمار ہونگی اس امر کو ان لینے کے بعد یہ بات کچھ دل میں کھٹکتی سی ہے کہ یہ لوگ بھی، جو حدیث کے فحوی کے مطابق مصلح اور مجدد دین ہیں، دین کے معاملہ میں غلطیاں کر جائیں۔ لیکن یہ تشبیہ بادی تاہل دور ہو جاتا ہے کسی شخص یا کسی گروہ کا حق پر ہونا یا اس کا مصلح و مجدد ہونا اس امر کو ہرگز مسترد نہیں ہے کہ وہ معصوم بھی ہو، عصمت خاصہ انبیاء ہے اور ان کے سوا کوئی نہیں ہے جو اس شرف سے ممتاز ہوتا ہو۔ انبیاء کے سوا کسی شخص یا کسی گروہ کے منتقل عقیدہ رکھنا کہ وہ معصوم ہے

اور اس سے کوئی غلطی ممکن ہی نہیں ہے، ایک سخت قسم کی ضلالت ہے۔ احادیث میں جس گروہ مصلحین کے برابر پیدا ہوتے رہنے کی جو خبر دی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ حق پر قائم رہیں گے اور لوگوں کے پیدا کیے ہوئے بگاڑ کی اصلاح کرتے رہیں گے۔ حق پر قائم رہنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک شخص سے کوئی غلطی ہی صادر نہ ہو۔ اس کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ متبع ہو اور طالب طریقہ جاہلیت نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اجتہاد میں غلطی کر جائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی امر کو مسلمانوں اور اسلام کے مصالح کے مطابق سمجھے لیکن فی الواقع وہ مصالح کے خلاف ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی امر کو درجِ دین کے مطابق خیال کر کے اختیار کرے اور اس کا لگان یہ ہو کہ یہ کم از کم نعم البدل کے حکم میں داخل ہے، لیکن اُس کے بعد آنے والے اس کے نقطہ نظر سے متفق نہ ہو سکیں اور وہ اس کو بدل ڈالیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص زمانہ کے عقلی و علمی تعلق سے تہذیب نفس و تزکیہ اخلاق کی کسی تدبیر کو احوال و ظروف کے موافق قرار دے دیں اور اس عہد کے مصلحین اس چیز کے اختیار کر لینے میں کوئی مضائقہ نہ پائیں، بلکہ طبائع کو اس تدبیر کے ساتھ مانوس پاکر ایک حد خاص تک اس کو اختیار کریں اور اس کی اصلاح کے کام کو بعد کے کام کرنے والوں پر چھوڑ دیں۔ اور بعد میں آنے والے اس کو اپنے احوال و ظروف کے موافق نہ پاکر اس کو یک قلم بدل ڈالیں۔ یہ ساری باتیں ممکن ہیں اور ان میں سے ہر بات مصلحین اور اہل حق سے ہوئی ہے اور ہو سکتی ہے اور ان کا ہونا ذرا بھی ان کی شانِ مصلحیت و مجددیت میں فرق پیدا کرنے والی چیز نہیں ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق سے بڑھ کر حق پر استوار اور کون ہو سکتا ہے؟ لیکن اُن سے بھی غلطیاں صادر ہوئیں اور انہوں نے نام لے لے کر خود اپنی غلطیاں گنوائیں کہ میں نے فلاں فلاں کام کیے کہ ڈالے ہیں جن پر مجھے افسوس اور ندامت ہے، کاش میں نے وہ کام نہ کیے ہوتے۔ اسی طرح انہوں نے فرمایا کہ فلاں فلاں تدبیروں کے اختیار نہ کرنے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی اور مجھے اس بات کا بڑا پچھتاوا ہے کہ میں نے وہ کام کیوں نہ کیے۔ حضرت ابو بکرؓ کی

صدیقیت کے بعد فاروق اعظم کی محدثیت سے کون انکار کر سکتا ہے اور ان سے زیادہ شیطان کے فتنوں سے کون محفوظ ہو سکتا ہے جن کا مرتبہ یہ بتایا گیا کہ شیطان وہ راستہ ہی چھوڑ کر ہٹ جاتا ہے جدھر سے اُن کا گذر ہوتا ہے۔ تاہم اس کے باوصف یہ واقعہ نہیں ہے کہ انہوں نے جیشِ اسامہ کے معاملہ میں، اہلِ ردہ کے معاملہ میں، جمعِ قرآن کے معاملہ میں جو رائیں قائم کیں وہ خود اُن کے ارشاد کے مطابق صحیح نہیں تھیں۔ میں نے ان دونوں بزرگوں کی غیر معمولی عظمت کی وجہ سے ان کا نام لے کر ذکر کیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ انہی پر دوسروں کو قیاس کیا جائے۔

امام مالک کے بارہ میں کون شک کر سکتا ہے کہ وہ حق پر قائم رہنے والے اور دین کو قائم کرنے والے نہیں تھے؟ لیکن کیا آپ حضرات ان پر تنقید نہیں کرتے؟ حضرت امام شافعیؒ کے ایک عظیم مصلح ہونے میں کون شخص شک لا سکتا ہے؟ لیکن آپ کے عربی مدرسوں میں کیا روزانہ اُن کی فقہ کے بچے نہیں اڑھیرے جاتے؟ امام احمد بن حنبلؒ کی جلالتِ مرتبہ اور ان کی شانِ مجددیت و مصححیت میں کسے اختلاف کی جرأت ہو سکتی ہے؟ لیکن کیا علمائے دین نے ان کی ساری علمی تحقیقات، اور ان کے تمام اجتہادات کو صحیح و درست مان لیا ہے؟ امام ابن تیمیہ اپنے زمانے کے مجددِ اعظم تھے اور ان کے دشمن بھی ان کے اس مرتبہ کا انکار نہیں کر سکتے۔ لیکن خود مولانا محمد منظور نعمانی نے ان کی سب سے زیادہ بلند پایہ کتاب میں ناصبیت کی جھلک دکھا دی۔

مذکورہ بالا بزرگانِ دین اور اکابرِ ملت میں سے کون ہے جس کا ظاہر علی الحق ہونا ہمارے یہاں مختلف فیہ ہو؟ لیکن اُن میں سے کسی کو بھی ہم معصوم نہیں مانتے۔ پھر اگر ان کو معصوم نہ مانتے سے ان کی عظمت و جلالت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، وہ بدستور مصلح اور ظاہر علی الحق باقی رہتے ہیں، ان کے ذریعے سے دین بھی نکھر رہا ہے، ختمِ رسالت کا تقاضا بھی پورا ہوتا ہے اور حدیث لا تزال طائفتہ... الخ کا انشا اور نبیؐ کی کسی خطہ میں نہیں پڑتا، تو آخر شاہِ صفا اور مجددِ صفاؒ پر تنقید کر دینے سے کیوں قیامت ٹوٹ پڑے گی اور کیوں حدیثِ تجدید اور ختمِ رسالت سب کا

انکار لازم آجایگا؟۔ ہم تو اس بات میں ذرا بھی تناقض نہیں پاتے کہ مجدد صاحب اور شاہ صاحب دونوں مجدد بھی ہوں اور ان سے ان کے کار تجدید میں بعض فروگزائیں بھی ہو گئی ہوں۔ ہم تو ان دونوں بزرگوں کے متعلق یہی حسن ظن رکھتے ہیں کہ ان شاء اللہ یہ قیامت کے روز زمرہ صالحین و مجددین ملت میں ہوں گے اور ان سے جو فروگزائیں ہوئی ہوں گی اللہ تعالیٰ ان کے حسن نیت کے بدلہ میں ان کو معاف فرمائے گا اور ان کی اجتہادی غلطیوں پر بھی ان کو اجر دے گا۔

بہر حال جماعت اسلامی کا موقف اس معاملہ میں یہ ہے کہ اس امت کے ہر دور میں مصلحین و مجددین پیدا ہوتے اور دین کو نکھارتے رہیں گے، لیکن وہ معصوم نہیں ہوں گے بلکہ ان سے ان کے کام میں مختلف قسم کی اجتہادی فروگزائیں بھی صادر ہو سکیں گی اور یہ چیز ان کی شان مصلحت و مجددیت میں کوئی فرق پیدا کرنے والی نہیں ہوگی۔ ان کے ظاہرین علی التحی ہونے کے بیسے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ معصوم ہوں بلکہ صرف یہ بات کافی ہے کہ وہ متبع ہواد اور اسلام میں جاہلیت کے گھسلنے والے نہ ہوں۔

جماعت اسلامی کے ناچیز کارکن اپنی نسبت بھی یہ گمان نہیں رکھتے کہ ہم سے اس کام میں غلطیاں نہیں ہو سکتیں۔ ہم نے بارہا غلطیاں کی ہیں اور پھر ان کی اصلاح کی ہے۔ آئندہ بھی ہم سے غلطیوں کا امکان ہے اور ہم ان میں سے جن غلطیوں پر مطلع ہو جائیں گے ان شاء اللہ ان کی اصلاح کریں گے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ہم اپنی بعض غلطیوں پر آخر تک مطلع نہ ہو سکیں اور ان پر ہمارے بعد آنے والے صالحین و مصلحین تنقیدیں کریں۔ ہم اپنے آپ کو برگزیدہ کا ایسا نکھارنے والا نہیں سمجھتے کہ ہم سے کوئی غلطی سرے سے ہوگی ہی نہیں۔ اگر ہماری کوئی حقیر خدمت و طغرائے اتیانہ نہیں ہے تو بس صرف یہ ہے کہ ہم اللہ کے پورے دین کی اتناست کے لیے اٹھے ہیں اور متبع ہواد اور اسلام میں جاہلیت کے گھسلنے والے نہیں ہیں بلکہ مبتدعین نے اسلام میں جو جاہلیت ملائی ہے اس سے اسلام کو پاک کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا نے اس بحث کے ضمن میں معلوم نہیں دونوں سے شائع ہونے والے ایک رسالہ کے

ایک مضمون کا ذکر کس مناسبت سے چھیڑا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا اشارہ رسالہ تجلی کے اس مضمون کی طرف ہے جس میں دیوبند اور مظاہر العلوم کے مفتیان عظام کو ان کی غلطی پر تنبیہ کیا گیا ہے۔ یہ مضمون غالباً کوثر کے صفحات میں میری نظر سے گذر ا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ یہ مضمون مجھے پسند آیا تھا۔ میں اگرچہ رسالہ تجلی یا اس کے لکھنے والوں کی صلاحیتوں سے کوئی سابقہ واقفیت نہیں رکھتا لیکن یہ مضمون ادبی اعتبار سے بھی اچھا تھا اور ایک اچھے رجحان فکر کا بھی تہہ دے رہا تھا۔ اس سے میں نے یہ خوشگوار نتیجہ اخذ کیا تھا کہ دیوبند میں سارے ہی استاد پرست اور گردہ پی تعصبات کے مریض نہیں ہیں، بلکہ ایک اچھی خاصی تعداد حق پرست اور انصاف پسند لوگوں کی بھی موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید اسی پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے کوثر نے اپنے صفحات میں اس مضمون کو جگہ دی ہوگی، نہ اس لیے کہ جماعت اسلامی کسی سند کی جھوٹی تھی اور یہ مضمون سامنے آتے ہی مدیر کوثر نے بیتاب ہو کر اسے ایک "آسانی شہادت" سمجھتے ہوئے اپنے صفحات میں نقل کر لیا۔ اگر مولانا محمد منظور صاحب ہم لوگوں کو کچھ بھی جانتے ہیں تو وہ اس بات سے بے خبر نہ ہونگے کہ مذمتوں اور تعریفوں سے اثر لینے کے معاملہ میں ہمارا کیا حال ہے۔

مولانا کو اگر "تجلی" کے اس مضمون کی بے لاگ صداقت سے تکلیف ہوئی ہے تو اس کی منرا اس مضمون کے لکھنے والوں اور ناثانے کرنے والوں کو دینی تھی۔ لیکن یہ عجیب ختم ظریفی ہے کہ مضمون تو کسی نے لکھا اور اس کی منرا جماعت کو دی جا رہی ہے۔ حالانکہ جماعت کا جرم صرف یہ ہے کہ اس کے اخبارات نے اس مضمون کو اپنے صفحات میں جگہ دے دی۔ ذرا مولانا کے تیور ملاحظہ ہوں نہلاتے ہیں؟ اگر واقعہ جماعت اسلامی وہی چاہتی ہے جو اس مضمون میں کہا گیا ہے تو پھر تو اس کا راستہ روکنا اور اس کی مخالفت کرنا مجھ صبیہوں کے نزدیک بھی خرافات میں سے ہوگا۔ اگر جاں بخشی ہو تو میں جواب میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ جماعت نے جہاں تک اپنے مقاصد کی ترجمانی کا تعلق ہے، اپنے "الما ری بھر دینے والے" ٹر بچر میں خود ہی کر دی ہے۔ اس کام کو اس نے رسالہ تجلی کے سپرد نہیں کیا ہے، لیکن میں تجلی کے مضمون نگار کی یہ بڑی حق تلفی سمجھتا ہوں کہ محض اس

اندیشے کی وجہ سے کہ اس کے مضمون کی تعریف سے مولانا ناخوش ہو جائیں گے اور جماعت کی نفی کرنا اپنا فرض سمجھتے لگیں گے اس کے مضمون کی تعریف نہ کی جائے۔ وہ مضمون نہایت خوب تھا اور نہایت ہی عمدہ اسلوب سے اس میں مفتیان کرام کو نہایت مفید مشورے دیے گئے تھے۔ مولانا کو چاہیے کہ اس سے بہرہ ہونے کے بجائے خود بھی اس سے فائدہ اٹھائیں اور دیوبند اور مظاہر العلوم کے مفتیوں کو بھی اس کی مفید نصیحتوں سے فائدہ اٹھانے کا مشورہ دیں۔ بڑوں کی نادانیوں پر اگر اپنے ہی گھر کے چھوٹے ٹوک دیا کریں تو اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے؟ وہ مضمون ہمارے لیے کچھ ایسا مفید نہیں تھا جتنا وہ خود آپ حضرات کے لیے مفید ہے۔ اب اگر محض اس غصہ کے سبب کہ جماعت اسلامی کے اخباروں نے اپنے صفحات میں اس کو نقل کر دیا ہے اس سے فائدہ نہ اٹھایا گیا تو یہ پرانے سنگوں پر خود اپنی ناک کٹوا لینے کے ہم معنی ہوگا۔

میں نے مضمون کے متعلق اپنی یہ ناچیز رائے محض اس خیال سے یہاں ظاہر کر دی ہے کہ مولانا نے یہ دھکی دی ہے کہ اگر جماعت کے ذمہ دار لوگوں نے اس مضمون سے اپنی براءت کا اعلان نہ کیا تو وہ جماعت کی مخالفت کرنا اپنے لیے فرض سمجھیں گے۔ میں اس کے جواب میں نہایت ادب سے یہ گزارش کرتا ہوں کہ اگر وہ اس ناچیز خادم کو کسی درجہ میں جماعت کا کوئی ذمہ دار آدمی سمجھتے ہیں تو لیجیے، میں نے یہ اظہار رائے کر دیا ہے۔ اب مولانا اپنا فرض ادا کرنے میں ہرگز تاثر نہ فرمائیں۔

(۵)

مولانا کو پانچویں شکایت جماعت اسلامی سے یہ ہے کہ اس نے پورے دین کی اقامت کی جدوجہد کا شرف تنہا اپنے لیے مخصوص سمجھ رکھا ہے، کسی اور جماعت کو اس شرف میں اپنا شریک و شہیم تسلیم کرنے کے لیے وہ تیار نہیں ہے۔ مولانا کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کی تبلیغی جماعت بھی اس شرف کی حق دار ہے۔ البتہ اس کا طریقہ کار جماعت اسلامی کے طریقہ کار سے مختلف ہے اس نے اپنے لیے حضرت امام حسنؑ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے طریقوں

اگر تبلیغی جماعت پر دین کی اقامت کے لیے جدوجہد کر رہی ہے تو چشم مارو تن دل ماشاد ہمارے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس راہ میں کچھ اور ہم سفر بھی ساتھ ہیں۔ ہم نے تبلیغی جماعت کی مخالفت کو نہ کبھی پہلے پسند کیا ہے اور نہ اب پسند کرتے ہیں۔ ہماری دلی خواہش برابر یہی رہی ہے اور یہی ہے کہ اس نے اپنے لیے جس طریق کو بھی پسند کیا ہے اس طریق پر کام کرتی رہے۔ ہم اس کے کام کو اپنے مقصد کے لیے مددگار خیال کرتے ہیں نہ کہ اس کا مخالف ہمارا تعلق اس جماعت سے شروع سے ہمدردانہ رہا ہے اور اب تک ہمدردانہ ہی ہے۔ اس تحریک سے ہماری دلچسپی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے کے لیے مولانا مودودی نے خود علائقہ میوات کا دورہ کیا اور پھر پڑھی لکھی پبلک میں نہایت عمدہ اسلوب سے اس تحریک کا تعارف کرایا۔ بلکہ شاید یہ کہنا بیجا نہ ہو کہ وہ پہلے شخص ہیں جن کے ذریعہ سے یہ تحریک میوات سے باہر کی پبلک میں متعارف ہوئی۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات کا بھی اچھی طرح علم ہے کہ اس کام میں جو نقص تھے مولانا مودودی نے شروع ہی میں وہ محسوس کر لیے تھے، لیکن اُن کا ذکر ذکر انہوں نے صرف مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم سے تنہائی میں کیا، پبلک میں ان باتوں کا ذکر نہ اس وقت پسند کیا تھا نہ اس کے بعد کبھی پسند کیا۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم اسی روش پر قائم رہے۔ لیکن پھر معلوم نہیں کن لوگوں نے یہ دستور اندازی شروع کر دی کہ جماعت اسلامی کا کام انبیاء علیہم السلام کے طریقہ سے ہونا ہے۔ انبیاء کتابیں کھہ لکھ کر نہیں چھاپا کرتے تھے۔ وہ تو ایک ایک شخص کے پاس پہنچا کر اُس کو تبلیغ کیا کرتے تھے۔ جماعت اسلامی تو بس تھوڑے سے پڑھے لکھے لوگوں کے اندر اپنا اثر پھیر فروخت کر رہی ہے۔ اصل محتاج تو عوام الناس کا گدہ ہے، لیکن جماعت اسلامی کہ اُن کی سرے سے کوئی پروا ہی نہیں ہے جماعت اسلامی کا کام تو تقویٰ کی روح سے خالی ہے، اگر تقویٰ کی بہار دیکھنی ہو تو مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم کی جماعت کے تبلیغی دعوہ کے ساتھ نکلو اور تقویٰ کی بہار دیکھو۔ جماعت اسلامی نے تو سیاست میں ٹانگ اڑانی شروع کر دی ہے اور اس نے خواہ مخواہ کو اپنی ایک

پاٹی بنائی ہے۔ ہم کو کسی پاٹی سے تعلق نہیں ہے، جس کا جی چاہے کانگریس میں شریک ہو اور جس کا جی چاہے مسلم لیگ میں شریک ہو جائے۔ ہم تو بس تبلیغ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھی کہ بعض نیک بختوں نے یہ تک کہنا شروع کر دیا کہ اصلی چیز تو اخلاص و تقویٰ ہے، اگر اس کی دولت موجود ہو تو آدمی ہر نظام کی نوکری اور تابعداری کر کے خدارسیدہ بن سکتا ہے۔ ————— اس طرح کی باتیں جب ہمارے ارکان کے کانوں میں مسلسل پڑنی شروع ہوئیں تو ہمارے ارکان نے ان امور کی بابت ہم سے سوالات کرنے شروع کیے۔ تب مولانا مودودی صاحب کو ان معاملات میں جماعت کا موقف واضح کرنا پڑا اور پھر مجھے بھی انبیاء کے طریقِ دعوت کے سلسلہ میں بعض ضروری پہلوؤں کی خالص علمی نقطہ نظر سے تشریح کرنی پڑی۔

اپنا پوزیشن واضح کرنا ضروری ہو چکا تھا اس لیے ہم نے واضح کر دیا۔ تاہم اُس وقت بھی ہماری دلی خواہش یہی تھی اور آج بھی یہی ہے کہ ان دونوں خادمِ دین جماعتوں کے کارکنوں میں کسی جگہ بھی کشمکش نہ ہو۔ لیکن مولانا محمد منظور صاحب نے ہماری اس روش کو پسند نہیں فرمایا۔ پہلے وہ دیرپہ جماعت اسلامی کے خلاف دوسرے اندازِ بیاں کرتے رہے، اور اب انہوں نے کھل کر اپنے اعتراضات پبلک میں شائع کر دیے ہیں تاکہ ہر جگہ تبلیغی جماعت کے ارکان جماعت اسلامی کی ٹکراہیوں پر پوری تیاری کے ساتھ خطبہ دے سکیں۔ اہل تقویٰ کے کام کرنے کے ڈھب یہ ہوتے ہیں؛

یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ مولانا نے اپنی جماعت کے موقف کو بدل کیوں دیا؟ اب تک تو یہ کہا جاتا تھا کہ انبیاء علیہم السلام کے طریقِ تبلیغ صرف تبلیغی جماعت ہی کرتی ہے۔ لیکن اب مولانا نے پہلی مرتبہ یہ اختلاف فرمایا ہے کہ تبلیغی جماعت نے اپنے لیے حضرت امام حسنؑ اور حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے تجربات کو لائقِ اتباع سمجھا ہے۔ اگر یہ تجربات انبیاء کے طریقہ سے الگ نہیں ہیں تو موقف بدلنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور اگر اُس سے الگ ہیں تو میں مولانا کو یہ مشورہ دوں گا کہ وہ کتابِ سنت کی کسوٹی پر اچھی طرح اس کو پرکھ لیں۔ لیکن ہے یہ اتباع اسی

طرح کی اتباع ہو جس طرح کی اتباع ایک پیرزادہ صاحب نے تصور شیخ کے معاملہ میں مجدد صاحب کی کی ہے۔ یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ ان بزرگوں نے تو یہ بات کچھ اور کہی ہو لیکن وہ کچھ کی کچھ بنا دی گئی ہو۔ مجھے امید ہے کہ مولانا میری اس گزارش کو بُرا نہ مانیں گے۔

بہر حال مولانا سے ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ اپنے کام کو جاری رکھیں۔ اگر وہ پورے دین کی اقامت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں تو ہم اس کا اعتراف کریں یا نہ کریں اللہ تعالیٰ ان کو ان کی خدمات کا صلہ دیگا، وہ خدا کے یہاں ہمارے سرٹیفکیٹ کے محتاج نہ ہوں گے۔ اور اگر وہ پورے دین کی خدمت نہیں کر رہے ہیں جب بھی بدول اور آرزوہ خاطر نہ ہوں، خدا کے دین کی حقیقی خدمت بھی وہ کریں گے وہ خدا کے دین ہی کی خدمت ہوگی، بشرطیکہ وہ دین کے دوسرے تادموں کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔

(۶)

چھٹا الزام مولانا نے جماعت کے ذمہ داروں پر تصوف سے محرومی اور بے خبری کا لگایا ہے۔ یہ الزام اس سے پہلے جناب حکیم عبدالرشید محمود صاحب بھی اپنے مضمون میں لگا چکے ہیں اور ہماری طرف سے انہی صفحات میں اس کا جواب بھی عرض کیا جا چکا ہے۔ مولانا کا طرز استدلال جناب حکیم صاحب قبلہ کے مضمون سے بہت اُگے ہے۔ میں مولانا کے مضمون کے غیر ضروری حصوں کو نظر انداز کر کے صرف ان کی بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

مولانا کا گمان ہے کہ جماعت اسلامی کے اہل قلم تصوف پر تنقید تو بڑی بے باکی سے کرتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کو تصوف کی معمولی ابتدائی باتوں کا بھی پتہ نہیں ہے۔ مولانا کا دعویٰ ہے کہ یہ بات وہ اپنے ذاتی تجربہ اور ذاتی واقفیت کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ مولانا کی یہ رائے نہایت غلط اندازہ پر مبنی ہے۔ جماعت کے اندر سب سے آدمی ایک ہی مذاق اور ایک ہی طبیعت کے نہیں ہیں۔ ممکن ہے جماعت کے بعض اہل علم کو تصوف سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہو اور انہوں نے اس فن کو کتاب و سنت سے بے تعلق سمجھ کر سراسر سے

اس کو ہاتھ ہی نہ لگایا ہو۔ لیکن اس سے یہ قیاس کر لینا کہ جماعت کے اندر سب ایک ہی مذاق کے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ کسی فن کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس فن کی تمام اہم غلم چیزیں پڑھی جائیں بلکہ اس مقصد کے لیے یہ کافی ہے کہ اس فن کی بعض اہم کتب تنقید کے ساتھ پڑھ لی جائیں۔ اگر ایک آدمی ذہین اور نقاد ہو تو اتنے ہی سے وہ پورے فن کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا لیتا ہے اور اگر اس میں نقد کی صلاحیت نہ ہو تو وہ ایک چیز پر پوری زندگی کھپا کر بھی اس سے بالکل کو رہتا ہے۔ مجھے اپنی ذات کی نسبت یہ اعتراف ہے کہ میں نے اس فن کا کچھ زیادہ مطالعہ نہیں کیا ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ میں نے اس فن کی کوئی چیز سرے سے پڑھی ہی نہیں ہے اور اس کی الف، ب جانے بغیر ہی اس پر تنقید شروع کر دی ہے تو اس کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ میں نے اس فن کی معتبر کتابوں میں سے رسالہ نقیثیہ کو بار بار پڑھا ہے۔ میں نے ابوطالب مکی کی قوت القلوب اس اہتمام کے ساتھ پڑھی ہے کہ میں معمولی تیاری سے اس کی غلاب کتاب و سنت باتوں پر ایک مقالہ املا کر دے سکتا ہوں۔ میں نے امام غزالی کی احیاء العلوم سطر سطر پڑھی ہے اور ایک زمانہ میں یہ کتاب مجھے بہت محبوب رہی ہے اور اب بھی مجھے ادبی اعتبار سے پوری کتاب اور مذہبی اعتبار سے اس کے بعض مباحث سے بڑی دلچسپی ہے۔ میں نے علامہ ابن قیم کی ضخیم اور عظیم الشان کتاب مدارج السالکین دو مرتبہ نہایت اہتمام کے ساتھ حرف بحرف پڑھی ہے۔ علامہ ابن قیم کی الفوائد، جو تصوف میں ہے، مجھے اس قدر پسند رہی ہے کہ میں ایک زمانہ میں اس کے مطالب ترتیب کے ساتھ اہل ذوق احباب کو زبانی سنایا کرتا تھا۔ شاہ صاحب کے بعض رسائل بھی میری نظر سے گذرے ہیں۔ کچھ دنوں شہنوی مولانا روم سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ دیوان حافظ کو میں نے بار بار نہایت ذوق سے پڑھا ہے اور چونکہ میرے استاد مولانا حمید الدین فرائی رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں کے بڑے مخالف تھے جو خواجہ صاحب کو مست بارہ انگوٹھی خیال کرتے تھے اس لیے میں نے بھی خواجہ صاحب کے کلام کو کلام معرفت ہی

کے پہلو کو سامنے رکھ کر پڑھنے کی کوشش کی۔ مجھے رواقیین (Stoics) کے فلسفہ اور تصوف سے ایک زمانہ میں اتنی دلچسپی رہی ہے اور انگریزی زبان کے واسطے سے میں نے اس کو اس قدر پڑھا ہے کہ اگر قرآن حکیم نے مجھے چایا نہ ہوتا تو میں بہت سی گمراہیوں میں مبتلا ہو جاتا۔ میں نے یوگا کی بھی بعض کتابیں پڑھی ہیں اور ہمارے تصوف میں اس کے جو اجزاء شامل کیے گئے ہیں میں ان کی نشان دہی کر سکتا ہوں۔

میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ میرا یہ مطالعہ اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ میں ایک پیر و مرشد بن کر بیٹھ جاؤں اور لوگوں کو تصوف کے اسرار و رموز بتانے شروع کر دوں۔ لیکن کیا یہ اس بات کے لیے بھی کافی نہیں ہے کہ میں یہ فیصلہ کر سکوں کہ تصوف کا کتاب و سنت سے کوئی تعلق ہے یا نہیں اور وہ ہمارے لیے کوئی مفید شے ہے یا مضر چیز ہے؟ مولانا نے دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ تصوف کو اگر کوئی شخص کتابوں میں پڑھ بھی لے جب بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ دنیا کی ان حقیقتوں میں سے ہے جو انظار کے معنی جان لینے سے ادراک کی گرفت میں نہیں آتیں۔ بلکہ یا تو یہ آدمی کو خود نصیب ہوتی ہیں یا بس آدمی کسی دوسری زندہ ہستی میں ان کا مشاہدہ کرتا ہے تب کچھ سمجھ میں آتی ہیں۔

مولانا کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم نے تصوف کا پوری تفصیل کے ساتھ مطالعہ بالضرر کیا بھی ہو جب بھی ہمیں اس کے متعلق زبان کھولنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے کیونکہ نہ تو ہمیں یہ چیز خود نصیب ہوئی ہے اور نہ ہم نے اس کا کسی زندہ ہستی میں مشاہدہ ہی کیا ہے۔ خود نہ حاصل ہونے کی وجہ تو غالباً یہ ہے کہ زعفران کی طرح تصوف کے بھی پیدا ہونے کا ایک خاص علاقہ ہے، اس دائرہ سے باہر اس کا اگنا ناممکن ہے۔ جو لوگ اس رقبہ مختص میں میں بستے ہیں بس انہی کے قلوب صافی ہیں یہ چیز اُگ سکتی ہے۔ باقی رہا کسی زندہ ہستی کا سوال جس کے اندر تصوف کی حقیقتوں کا مشاہدہ کیا جاسکے، تو اس چیز کا اب کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا، کیونکہ مولانا مجھے خود اپنے ایک گرامی نامہ میں، ابھی حال ہی میں، یہ لکھ چکے ہیں کہ

اس قسم کی ہستی بس ایک ہی تھی اور وہ اٹھ گئی۔ مولانا یہ بھی فرماتے ہیں کہ وہ ہستی اگر موجود ہوتی تو وہ مجھ کو اور مودودی صاحب کو لے جا کے تصوف کی زندہ حقیقت دکھالتے۔ بہر حال اب چونکہ وہ واحد ہستی بھی موجود نہیں رہی اس لیے تصوف کے بارہ میں کتب لسان کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں باقی رہا۔ تصوف کو الفاظ سے سمجھا نہیں جاسکتا اور کوئی ایسی ہستی اب، خود مولانا کے بقول موجود نہیں رہی جس کی زندگی کے اندر اس کے جلوے دیکھے جاسکیں۔ ع

اب کسے رہنا کرے کوئی !

مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ آخر تصوف ہی کی یہ خصوصیت کیوں ہے کہ اس کو بس کسی زندہ آدمی ہی کے اندر دیکھا جاسکتا ہے، اس کے بغیر اس کی حقیقت نہیں جانی جاسکتی؛ اگر ایک طالب حقیقت اللہ کی کتاب کو سمجھ سکتا ہے، اگر ایک سلیم الطبع آدمی رسول اللہ کی حدیث کو سمجھ سکتا ہے اور تصوف کے مدعیوں سے کہیں زیادہ بہتر طریقہ پر سمجھ سکتا ہے، تو آخر تصوف ہی کے ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ اس کو نہیں سمجھا جاسکتا؛ اگر یہ تصوف قرآن و حدیث ہی سے نکلا ہوا ہے تو اس کو سمجھ میں آنا چاہیے۔ لیکن اگر قرآن اور حدیث سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر بہتر ہے کہ یہ نہ سمجھیں آئے۔ ایک مسلمان کا اُس چیز سے محروم ہی رہنا اچھا ہے جو قرآن اور حدیث سے بے تعلق ہے۔ ہمارے نبی کریم صلعم نے فرمایا ہے کہ من حسن اسلام المرء توكد ما لا يعنيه۔ یہ آدمی کے اسلام کی خوبی ہے کہ وہ غیر متعلق باتوں میں نہ پڑے۔

مولانا نے اس مضمون کے اس حصہ میں اپنے بعض ذاتی تجربات کا بھی حوالہ دیا ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربات کو لائق ذکر تو نہیں سمجھتا لیکن مولانا اجازت فرمائیں تو میں بھی اپنا ایک ذاتی تجربہ عرض کرنے کی جرأت کروں۔

میں نے آج تک جتنے آدمی بھی خانقاہی طریق پر تربیت پائے ہوئے یا خانقاہی طریق پر تربیت کرنے والے دیکھے ہیں ان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جس میں نے وہ باتیں محسوس کی ہوں جن کو مولانا تصوف کا خاصہ بتاتے ہیں۔ بعض اشخاص کی ظاہری دینداری سے

میں وقتی طور پر اگر متاثر بھی ہوا تو میں نے دیکھا کہ دوسرے پہلوؤں سے وہ بہت خام ہیں۔ میرے علم میں متعدد ایسے اشخاص بھی ہیں جو خانقاہی تزکیہ سے پہلے نہایت معقول قسم کے آدمی تھے لیکن خانقاہی تزکیہ کے کورس سے گزرنے کے بعد وہ بالکل مصنوعی قسم کے آدمی بن کے رہ گئے۔ یہ میں عام آدمیوں کی باتیں نہیں کہ رہا ہوں بلکہ ان لوگوں کی باتیں کہ رہا ہوں جن کو بڑا سمجھا جاتا ہے۔ ہاں ایک اور صرف ایک شخص کو دیکھا ہے جو ان تمام خصوصیات کا صحیح طور پر حامل تھا جو مولانا تصوف کی بتاتے ہیں لیکن میں بالیقین جانتا ہوں کہ اس کے اندر یہ خوبیاں تصوف کی راہ سے نہیں آئی تھیں بلکہ تدبیر قرآن اور اتباع سنت کی راہ سے آئی تھیں۔ انہیں ایسا ہے کہ یہ ہستی بھی اٹھ گئی ورنہ میں مولانا کو دکھاتا کہ تصوف کے بغیر دنیا میں ایسے ایسے اہل کمال پیدا ہوتے ہیں۔

مولانا کو یہ بھی شکایت ہے کہ ہم نے تصوف کے خلاف جو باتیں لکھ دی ہیں ان کا اثر یہ ہوا ہے کہ جو باتیں مجدد صاحب، شاہ صاحب، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہم کے سلسلہ سلوک کے اشتغال و اعمال میں داخل ہیں جماعت اسلامی کے ٹرچر کے تیار کیے ہوئے "محققین" و "مجتہدین" ان کو بھی بدعت و ضلالت قرار دے دیتے ہیں۔

مولانا کا یہ اعتراف تہہ دیتا ہے کہ ان کے سوچنے کا انداز کتنا غلط واقع ہوا ہے میں ان کی غلطی کی سنگینی کو واضح کرنے کے لیے یہاں ایک بات بطور مثال ذکر کرتا ہوں۔ پچھلے دنوں ایک پیرزادہ صاحب کا ایک مضمون انہی صفحات میں میرے جواب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ پیرزادہ صاحب نے اپنے مضمون میں تصوف کی برکات پر بحث فرماتے ہوئے ایک جگہ "تصویر شیخ" کا بھی ذکر فرمایا اور اس کی ایک عجیب و غریب توجیہ پیش کی۔ میں نے اس توجیہ پر تنقید کی اور یہ ثابت کیا کہ اگر تصویر شیخ کی توجیہ یہی ہے تو اس کے خلاف کتاب و سنت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے اور اس کے دلائل یہ ہیں۔ میرے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد مولانا محمد منظور صاحب نے مجھے ایک مفصل خط لکھا جس میں مجھے ان خیالات کے اظہار پر نہایت سخت ملامت

کی جو میں نے تصور شیخ کے بارے میں ظاہر کیے تھے۔ اور فرمایا کہ تم سے بڑی ہی سخت غلطی ہو گئی ہے، فوراً توبہ کرو اور اپنے ان خیالات سے رجوع کا اعلان کرو۔ نہیں تپہ نہیں ہے کہ تصور شیخ کے قائل تو شاہ صاحب اور مجدد صاحب بھی رہے ہیں، تم نے ان بزرگوں کو بھی کافر بنا ڈالا، کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ حضرات "تحقیق شرک" اور حقیقت توحید کے مصنف کے برابر بھی شرک و توحید کے امتیاز کو نہیں سمجھتے تھے؟

میں مولانا کے ساتھ ایک مدت سے جن نطن ہی نہیں بلکہ محبت بھی رکھتا ہوں۔ لیکن ان کے اس خط کو پڑھ کر ان کے اس سوچنے کے انداز سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ چند انخاص کی طرف جو کچھ منسوب کر دیا جائے اور جن توجیہات کے ساتھ بھی منسوب کر دیا جائے اس کو وہ بے تکلف ایک ثابت شدہ حقیقت کی طرح مان لیتے ہیں۔ فرض کریجیے کہ تصور شیخ مجدد صاحب اور شاہ صاحب کی کتابوں میں مذکور بھی ہو تو اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ ان کے نزدیک اس کی وہی توجیہ بھی رہی ہو جو پیرزادہ صاحب نے پیش کی تھی؟ اور اگر خدا نخواستہ شاہ صاحب اور مجدد صاحب اسی توجیہ کے ساتھ اس کو اختیار کیے ہوئے تھے جس توجیہ کے ساتھ پیرزادہ صاحب نے اس کو پیش کیا تھا اور اس بات کی ان دونوں بزرگوں کی کتابوں سے تصدیق بھی ہوتی تھی، تو ایک سچے مسلمان کے لیے اس معاملہ میں کیا رویہ صحیح تھا؟ کیا یہ کہ محض اس بنیاد پر کہ یہ بات شاہ صاحب اور مجدد صاحب نے لکھ دی ہے وہ اس کو مان لیتا، یا یہ کہ وہ ظاہر کتاب و سنت پر قائم رہتا اور یہ خیال کرتا کہ اس معاملہ میں ان بزرگوں سے یا تو مسامحت ہو گئی ہے یا کم از کم یہ کہ ان کی دلیل قابلِ اطمینان نہیں ہے اس لیے اس سے احتراز ضروری ہے؟ میرے نزدیک ایک خدا پرست اور متبع سنت مسلمان کے لیے صحیح ایمانی روش یہی دوسری ہے۔ لیکن مولانا نے محض اس دلیل کی بنا پر کہ یہ بات شاہ صاحب اور مجدد صاحب کے سلوک میں موجود ہے ایک صریح ضلالت کے قبول کرنے پر مجھ سے اصرار کیا اور یہ توفیق آخر وقت تک انہیں نہ ہوئی کہ تصور شیخ کی کوئی ایسی توجیہ پیش کرتے جس کو ایک مسلمان توحید پر قائم رہتے ہوئے قبول کر سکتا ہو۔ یہ تو اللہ کی مہربانی ہوئی کہ مودنا ہی کے ایک بزرگ نے میری تائید کر دی

اور میری جان چھوٹی درد نہ ایک اور فتوے تکفیر کے لیے سامان فراہم ہو چکا تھا۔ یہاں میں اس امر کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ تصوری شیخ کی جو توجہ حال میں مولانا غفر احمد صاحب نے پیش کی ہے میں اس کو بھی بیزارہ صاحب کی توجہ سے کم غلط نہیں سمجھتا، لیکن چونکہ میں ان مسائل کو غیر ضروری خیال کرتا ہوں اس لیے ان پر صرف وقت کو پسند نہیں کرتا۔

مولانا نے اس سلسلہ میں ایک بحث یہ بھی اٹھائی ہے کہ جماعت اسلامی کسی ایسے شخص کو اپنے دائرہ میں نہیں لیتی جو کسی سلسلہ سلوک سے انتساب اور کسی صاحب ارشاد شیخ سے اصلاح و تربیت کا تعلق رکھتا ہو۔ اور پھر اس پر یہ دلچسپ سوال پیدا کیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر آج مجدد صاحب، شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ اسماعیل شہید اس دنیا میں ہوتے تو اپنے اس مکانہ اور فتوے کی وجہ سے وہ بھی جماعت اسلامی کی رکنیت کے لائق نہ سمجھے جاتے۔

جہاں تک جماعت کی رکنیت کے معاملہ کا تعلق ہے مولانا اس بات سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ دستور جماعت میں رکنیت کی تمام ضروری شرطیں بیان کر دی گئی ہیں۔ ہر شخص جو ان شرطوں کو پورا کر سکے وہ جماعت کا رکن ہو سکتا ہے، خواہ وہ کوئی ہو۔ اگر ایک شخص کسی سلسلہ سلوک کے ساتھ انتساب رکھتا ہے یا کسی شخص سے اصلاح و تربیت کا تعلق رکھتا ہے، لیکن یہ انتساب نہ تعلق نہ اس کے لیے جماعتی دستور کے مطاببات کی تکمیل میں مانع ہوتا ہے نہ اس کو جماعتی دستور کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی پر مجبور کرتا ہے، تو وہ شخص جماعت کا رکن بن سکتا ہے۔ البتہ یہ بات بالکل مبہل ہے کہ ایک شخص بیک وقت دو معتدوں کا قلابہ اپنی گردن میں ڈالے اور آٹھ ایک ایک کے مطاببات دوسرے کے اکثر معاملات سے متصادم ہوں۔ پیری مریدی کے نظام میں یہ دو عملی چل سکتی ہے اور چلتی رہتی ہے لیکن جو جماعت دین کو بحیثیت ایک نظام زندگی کے برپا کرنے کے لیے بنائی گئی ہو اس میں یہ عجوبہ کا دوبار کس طرح چل سکتا ہے کہ ایک شخص معیت تو کسی سے کرے اور اطاعت کسی اور کی کرے، اس طرح کی باتیں ان نظاموں میں چلتی ہیں جو دین و دنیا کی تفریق کے نظریہ پر قائم ہیں، جماعت اسلامی کا پورا نظام اس تفریق کے بالکل خلاف ہے۔

یہ مولانا کے اصل اعتراض کا جواب تھا۔ یہی یہ بات کہ اگر مجدد صاحب، شاہ صاحب اور مولانا اسماعیل شہید اس زمانہ میں ہوتے تو وہ اپنے اس "تصور" کے ہوتے ہوئے جماعت اسلامی کے کین بن سکتے یا نہیں، تو مولانا اس سوال کے جواب کے لیے پریشان نہ ہوں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر یہ بزرگان دین موجود ہوتے تو وہ موجودہ زمانہ کی پیری مریڈی کے لاطائل جھیلوں میں پڑنے کے بجائے انشاء اللہ جماعت اسلامی قائم کرنے اور انہی طریقوں پر مسلمانوں کی اصلاح کرتے جن طریقوں پر ہم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ البتہ آپ کے مدرسوں اور خانقاہوں سے ان کی وہی تواضع ہوتی جو آج ہماری ہو رہی ہے۔

مولانا نے ہم لوگوں کو یہ نصیحت فرمائی ہے کہ تصوف کی جتنی ضرورت تم لوگوں کو ہے اتنی ضرورت دوسروں کو نہیں ہے۔ تم اقامت دین کی جس ہم کو نے کھڑے ہوئے ہو، اس کے کارکنوں میں یقین و توکل اور عشق و جنون کے جو اوصاف مطلوب ہیں وہ صرف تصوف ہی کی راہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے مولانا کی اس قیمتی نصیحت پر بار بار غور کیا اور چونکہ میں ان سے حسن ظن اور محبت رکھتا ہوں اس لیے مجھے کبھی کبھی یہ شبہ بھی لاحق ہوا کہ ممکن ہے مولانا ایک صحیح بات کہہ رہے ہوں اور ہم اپنی جدوجہد کے سلسلہ میں ایک ایسی چیز سے غفلت برت رہے ہوں جو اس راہ میں ضروری ہو۔ لیکن اب مجھے پوری طرح اطمینان ہو گیا ہے کہ تصوف ہمارے اس کام کے سلسلہ میں ذرا بھی ضروری نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک آدمی اگر اقامت دین کی جدوجہد میں غلوں کے ساتھ لگ جائے تو اس راہ کی سرگرمیاں اور اس کے تجربات خود اس کو ان لوگوں سے کہیں زیادہ بہتر آدمی بنا دیتے ہیں جو ہماری خانقاہوں میں تیار ہوتے ہیں۔ میرے پاس اس دعوے کا نہایت ناقابل تردید ثبوت موجود ہے۔ جن حضرات نے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی تکفیر کے فتوے دیے ہیں ان کے ناموں کی طول طویل فہرست پر نگاہ ڈیے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ ان میں ایک شخص بھی غالباً ایسا نہیں ہے جس نے خانقاہی طریق پر تربیت نہ پائی ہو۔ انہوں نے صرف تربیت ہی نہیں پائی ہے بلکہ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو ایک مدت دراز سے لوگوں کا تزکیہ بھی کر رہے ہیں اور ایک خلیف

جو تیسرے خدمت اقامت دین کی انجام پائی ہے اس نے آج ہزاروں انسان ایسے تیار کر دیے ہیں جو اپنے روزمرہ معاملات زندگی میں اُس سے کہیں زیادہ خوفِ آخرت کا لحاظ رکھتے ہیں جتنا آپ کے مفتیان دینِ فتنیٰ کہنے میں رکھتے ہیں۔ برعکس اس کے تصوف کے حاصل کا حال یہ ہے کہ آپ آج ایک شخص کو بھی نہیں پیش کر سکتے جس پر آپ کو اطمینان ہو کہ یہ تصوف کی برکات کا نمونہ ہے پھر یہ مذہبوں کا لاماصل تجربہ آخر آپ حضرات کی آنکھیں کیوں نہیں کھلتا؟

آخری اعتراض مولانا نے جماعت کے اس اصول پر کیا ہے کہ جماعت ہر اس نظام حکومت سے تعاون کو حرام قرار دیتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے نظریہ پر مبنی نہ ہو۔ مولانا نے اس اصول پر اعتراض کرتے ہوئے جہاں بعض شرعی دلائل اپنے خیال کی حمایت میں پیش کیے ہیں وہاں خود اپنے متعلق بظاہر فرمایا ہے کہ انہوں نے شروع ہی میں مولانا مودودی سے اس مسئلہ کے بارے میں گفتگو کی تھی اور اس وقت یہ طے ہو گیا تھا کہ غیر اسلامی نظام حکومت سے تعاون نہ کرنا اور نوکری وغیرہ کے ذریعہ اس سے استفادہ نہ کرنا ہر رکن کے لیے ضروری تو قرار دیا جائے گا لیکن اس مسئلہ کو شرعی حیثیت نہیں دی جائے گی، لیکن نہ معلوم دستور میں پھر یہ چیز مسئلہ کی نوعیت سے کس تغافل کی وجہ سے رہ گئی۔

مولانا نے جس دستور کی تسامح کی طرف توجہ دلائی ہے اور اپنی اور مولانا مودودی کی جس باہمی قرارداد کا حوالہ دیا ہے راقم کو اس کے بارے میں کچھ معلومات نہیں ہیں۔ کیونکہ راقم جماعت کے پہلے اجتماع میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اس لیے میں یہاں مولانا مودودی صاحب کے ایک خط کا اقتباس پیش کرتا ہوں جو انہوں نے حال میں اس معاملہ سے متعلق ایک مفسر کو لکھا ہے۔ مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

”جماعت اسلامی کے قیام سے پہلے اس کے دستور العمل کا ایک خاکہ مرتب کیا

گیا تھا اور وہ ان تمام لوگوں کے پاس غور و خوض کے لیے بھیجا گیا تھا جو اس وقت

ترجمان القرآن کی دعوت سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان میں ایک مولانا منظور صاحب

بھی تھے۔ اس مسودہ دستور میں عقیدہ توحید کی تشریح چند فقرات میں کی گئی تھی جن

میں سے پانچواں فقرہ یہ تھا:-

واللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک، الملک، مقتدر اعلیٰ نہ تسلیم کرنے کسی کو
 باختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہ سمجھے کسی کو شارع اور قانون ساز
 نہ مانے۔ اور ان تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے جو ایک اللہ
 کی اطاعت کے ماتحت اور اس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں۔ کیونکہ
 اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ
 ہے۔ اس کے سوا کسی کو مالکیت اور حاکمیت کا حق نہیں پہنچتا)

یہ فقرہ کلمہ لا الہ الا اللہ کو ماننے کے لازم میں شامل تھا اور میں یقین کے ساتھ
 کہتا ہوں کہ اس فقرے پر مولانا محمد منظور صاحب کی طرف سے میرے پاس کوئی اعتراض
 نہیں آیا بلکہ اس وقت مولانا خود بھی پورے زور کے ساتھ ایمان باللہ کے لازم میں
 اس کو بیان فرمایا کرتے تھے۔

پھر اگست ۱۹۵۵ء میں میرے ہاں ہندوستان بھر سے ۵۰ اصحاب تشریف
 لائے جو اس مسودے کو پسند کر کے تشکیل جماعت پر آمادہ تھے۔ اس ابتدائی
 اجتماع میں مولانا محمد منظور صاحب بھی شریک تھے۔ وہاں اس مسودہ کو لفظ بلفظ
 پڑھا گیا اور اس میں ضروری ترمیمات کی گئیں۔ پھر ترمیم شدہ دستور کو تمام حاضرین
 نے بشمول مولانا محمد منظور صاحب، منظور کیا اور اللہ تعالیٰ کو گواہ کر کے اقرار کیا
 کہ وہ اس دستور کے مطابق نظام جماعت کے پابند رہیں گے۔ اس ترمیم شدہ
 دستور میں بھی یہ فقرہ جوں کا توں باقی رہا اور آج اس اجتماع کے بہت سے شرکاء
 زندہ موجود ہیں، وہ شہادت دے سکتے ہیں کہ مولانا نے اس فقرہ پر کوئی اعتراض
 نہیں فرمایا تھا۔

اس کے بعد وہ منظور شدہ دستور باقاعدہ شائع کیا گیا اور مولانا کے پاس

بھی وہ ایک رکن جماعت کی حیثیت سے پہنچا۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ مولانا کی طرف سے میرے پاس کوئی احتجاج اس بات پر نہیں آیا کہ یہ فقرہ دستور میں کیسے شامل ہو گیا ہے۔

اسی طرح اس دستور کی دفعہ ۱۱ میں لکھا تھا کہ ”ادائے شہادت کے بعد جو تغیرات ہر رکن جماعت کو اپنی زندگی میں لازماً کرنے ہوں گے وہ یہ ہیں۔“ پھر ان تغیرات میں ضمن ۵۔ و اور میں واضح طور پر غیر الہی نظام حکومت کے مناصب خطابات اور مجالس قانون سازی کی رکنیت کو ترک کر دینے کا ذکر کیا گیا تھا اور یہ تصریح کی گئی تھی کہ جس شخص کی زندگی میں یہ تغیرات نہ ہوں اس کے متعلق یہ سمجھا جائیگا کہ وہ مکمل شہادت ادا کرنے میں صادق نہ تھا اور اس بنا پر وہ جماعت سے خارج کیا جائیگا۔ یہ دفعہ مسودے میں بھی موجود تھی، پہلے اجتماع میں مولانا محمد منظور صاحب کے سامنے پڑھی بھی گئی، بالاتفاق منظور بھی ہوئی، اور اجتماع کے بعد جماعت کے باقاعدہ دستور کی حیثیت سے شائع بھی ہوئی۔ اس تمام کارروائی میں مولانا محمد منظور صاحب شریک رہے اور کبھی ایک لفظ اس کے خلاف نہ کہا۔ بلکہ تمام ارکان جماعت اُس وقت یہی سمجھتے تھے کہ مولانا کا عقیدہ و مسلک یہی ہے اور جماعت سے اُن کی علیحدگی کے بعد بھی ارکان جماعت کا بالعموم یہی خیال تھا کہ ان کی بے اطمینانی کے وجہ دوسرے ہیں، عقیدہ و مسلک اور نصب العین کی حد تک وہ ہمارے ساتھ ہیں۔“

یہ بیان مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت اسلامی کا ہے جو شروع سے جماعت کے سارے حالات سے براہ راست واقف ہیں۔ میں اس پر صرف اتنا اضافہ کر سکتا ہوں کہ جماعت کے دوسرے اجتماع میں راقم سطور بھی شریک تھا۔ اُس موقع پر مولانا نے میرے اور مولانا ابوالاعلیٰ صاحب کے سامنے دستور کے بعض الفاظ اور فقروں پر مولانا تھانوی مرحوم یا ان کے حلقہ کے لوگوں کے تاثرات پیش کیے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُن کا تعلق دستور کے بعض الفاظ

اور بقروں ہی سے تھا، کسی اصولی چیز سے ہرگز نہیں تھا۔ مولانا نے جماعت سے علیحدگی کے بعد مجھ سے میرے وطن میں ملاقات کی تھی اور اپنی علیحدگی کے متعلق سارے حالات تفصیل کے ساتھ مجھے سنائے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس موقع پر بھی مولانا نے اس اصولی اختلاف کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس کے بعد بھی مولانا سے میری ملاقاتیں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں اور ہم جماعت کے مسائل پر گفتگوئیں بھی کرتے رہے ہیں۔ لیکن میں نے کبھی نہیں محسوس کیا کہ مولانا جماعت سے کوئی اصولی اختلاف رکھتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ ان کے اختلاف کو محض ایک جذباتی اختلاف سمجھا۔

اب تھوڑی دیر کے لیے اس بحث کو نظر انداز کیجیے کہ مولانا پہلے ہی سے مذکورہ بالا اصول کے مخالف تھے یا اب اس کے مخالف ہو گئے ہیں۔ آئیے اس امر کا تعین کریں کہ مولانا مخالف کس چیز کے ہیں؟ عقیدہ توحید کی تشریح کے اُس حصہ کے جو پانچویں فقرہ میں بیان ہوئی ہے یا دفعہ ۴ کے ان مطلوبہ تغیرات کے جو ضمیمہ ۶-۷ اور ۸ میں بیان ہوئے ہیں؟ اس کا تعین ہمیں خود مولانا کے بیان کی روشنی میں کرنا چاہیے۔

مولانا اپنے مضمون مندرجہ الفرقان میں فرماتے ہیں:-

مولانا مودودی سے خود اس عاجز نے اس مسئلہ کے بارے میں گفتگو کی تھی اور اس وقت یہ طے ہو گیا تھا کہ غیر اسلامی نظام حکومت سے تعاون نہ کرنا اور نوکری وغیرہ کے ذریعہ اس سے استفادہ نہ کرنا ہر رکن کے لیے ضروری تو قرار دیا جائے گا لیکن اس کو شرعی مسئلہ کی حیثیت نہیں دی جائے گی۔

مولانا کے اس بیان سے ایک بات تو یہ معین ہوئی کہ مولانا کو عقیدہ توحید کی اُس تشریح سے کوئی اختلاف نہیں ہے جو پانچویں فقرہ میں بیان ہوئی ہے۔ دوسری بات یہ معین ہو گئی کہ مولانا کو اس امر سے بھی کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ”غیر اسلامی نظام حکومت سے تعاون نہ کرنا اور نوکری وغیرہ کے ذریعہ اس سے استفادہ نہ کرنا ہر رکن کے لیے ضروری قرار دیا جائے“۔ تیسری بات یہ معین ہو گئی کہ مولانا کو اختلاف اس بات سے ہے کہ غیر اسلامی نظام حکومت سے تعاون نہ کرنے

کو ایک شرعی مسئلہ بنا دیا گیا ہے۔

گویا خلاصہ بحث یہ نکلا کہ جماعت نے جو عقیدہ بیان کیا وہ درست۔ اس عقیدہ کے مقتضائے مطابق اپنے ارکان سے، پیش نظر حالات میں اُس شخص غیرات کا مطالبہ کیا وہ بھی درست۔ البتہ اُس سے یہ جرم صادر ہو گیا کہ اس نے ان مطالبات کو شریعت اور دین کے مطالبات کی حیثیت سے پیش کیا، یہ کہہ کر نہیں پیش کیا کہ یہ ہمارے اپنے ذاتی مطالبات ہیں، ان کو دین و مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

میں مولانا سے باور پوچھتا ہوں کہ اگر یہ مطالبات دین کے مطالبات نہیں ہیں تو آخر ہمیں کیا حق ہے کہ ہم اپنے ارکان سے ان کی تعمیل کا مطالبہ کریں؟ جماعت اسلامی عام اصطلاح میں کوئی سیاسی پارٹی نہیں ہے کہ محض اپنی صوابدید پر جس چیز کو چاہے ضروری قرار دے دے اور جس چیز کو چاہے غیر ضروری قرار دے دے۔ وہ تو ہر معاملہ میں اسلام کے اصولوں اور ان کے مخویٰ اور مقتضائے کو سامنے رکھ ہی کے فیصلہ کرتی ہے۔ اگر اس کے بغیر وہ کوئی قدم اٹھائے تو اس کے ارکان اس سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ تم نے یہ قدم اسلام کے کس اصول کی روشنی میں اٹھایا ہے؟

ہم نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی بنے نکلے پورے شرح صدر کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ کسی غیر الہی نظام کے ساتھ تعاون حرام ہے۔ مسلمانوں کو قرآن مجید میں نہایت تصریح کے ساتھ یہ ہدایت کی گئی ہے کہ صرف اُس نظام کے ساتھ تعاون کہ وہ جو خدا کی وفاداری اور حدود اللہ کی پاسداری پر قائم کیا گیا ہو، اُس نظام کے ساتھ ہرگز تعاون نہ کرو جو حق تعالیٰ اور تقدی پر قائم کیا گیا ہو۔ تعاون علی البر والیقوی ولا تعاون علی الاثم والعدوان۔ اس تصریح کے بعد، جس میں کوئی اشتباہ نہیں ہے، مسلمان کے لیے یہ بات کیسے جائز ہو سکتی ہے کہ وہ کسی غیر الہی نظام کے ساتھ تعاون کرے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی نظام غیر الہی ہو اور وہ بر تقدی کا نظام بن سکے؟ یا کوئی نظام غیر الہی ہو اور وہ اثم وعدوان سے پاک ہو سکے؟ اگر یہ دونوں باتیں محال ہیں تو یہ بھی محال ہے کہ کوئی مسلمان خدا کے اس حکم کی خلاف ورزی کیے بغیر کسی غیر الہی نظام سے تعاون کا رشتہ قائم

کر سکے کسی نظام کے ساتھ تعاون کے معنی ہیں اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں اور اپنی تمام قوتوں اور قابلیتوں کو اس کے برپا کرنے اور پروان چڑھانے میں صرف کرنا۔ کیا مولانا یہ فرما سکتے ہیں کہ ایک مسلمان کی قوتیں اور قابلیتیں اسی لیے ہوتی ہیں کہ وہ ایک نظام باطل کو پروان چڑھانے میں صرف ہوں؟ اور کیا مولانا یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی صحیح الدماغ مفتی نے آج تک اس بات کے جواز کا فتویٰ دیا ہے یا دے سکتا ہے؟

مولانا معاف فرمائیں وہ جاننے کسی چیز کو ثابت کرنا چاہتے ہیں اور دلیل کسی اور چیز کی دے رہے ہیں۔ وہ دعویٰ تو کر رہے ہیں نظام باطل کے ساتھ بعض حالات میں تعاون کے جائز ہونے کا اور دلیل دے رہے ہیں دو ناگزیر برائیوں میں سے ہلکی برائی کے اختیار کے جواز کی۔ یہ چیز تو ایسی ہے جس سے نہ ہمیں اختلاف ہے اور نہ کسی شخص کو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ اگر صورت حال یہ ہو کہ ہمارے لیے صرف دو برائیاں ہی برائیاں ہوں جن میں سے ایک کو اختیار کرنا پڑ جائے، کوئی تیسری راہ نیکی اور خیر کی سرے سے موجود ہی نہ ہو تو بلاشبہ ہمیں ان دونوں میں سے اُس برائی کو ترجیح دینی پڑے گی جو ہمارے اپنے مفاد دینی و ملی کے نقطہ نظر سے ہلکی ہو، اور اس وقت ہمارا ایسا کرنا ہی ہمارے دین کا تقاضا ہو گا۔ لیکن اگر ہمارے سامنے ایک ایسی راہ بھی کھلی ہو جس پر چل کر ہم اپنے نصب العین کی طرف براہ راست مارچ کر سکتے ہوں، تو پھر ہمارے لیے اُس راہ کے سوا کوئی اور راہ اختیار کرنا ناجائز ہے۔ میں اس بات کو ایک مثال سے سمجھاتا ہوں غیر منقسم ہندوستان میں جبکہ ہم نے اپنا دستور بنایا تھا اس وقت ہم نے انگریزی نظام کے ساتھ ہر قسم کے تعاون کو حرام قرار دیا تھا، اس لیے کہ ملک کے سیاسی نظام کے اندر ہمارے لیے اس بات کی گنجائش موجود تھی کہ ہم براہ راست اپنے نصب العین کے مطابق ملک کے نظام کو تبدیل کرنے کے لیے جدوجہد کر سکتے تھے۔ پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم انگریزوں کی گاڑی و خیرہ کھینچنے پر قانع رہتے، یا ملک میں اُس نوع کی تبدیلی کے لیے جدوجہد کرتے جس نوع کی تبدیلی دوسری سیاسی جماعتیں پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن فرض کیجیے کہ اُسی زمانہ میں نازیوں نے ہندوستان پر حملہ کر دیا ہوتا

اور اس کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہوتا کہ ہندوستان پر جاپان یا جرمنی کا قبضہ ہو جائے گا اور ان کی حکومت ہمارے لیے نظام حق کے قیام کی مبدوہد کے اتنے مواقع بھی باقی نہ رہ سکیں گے جو انگریزی حکومت میں موجود ہیں تو ہم انگریزوں کے نظام کو جو ممنوں یا جا پانیوں کے حملہ سے بچانے کی ضرورت کو شش کرتے۔ اس لیے نہیں کہ ایسی صورت میں ہمارے لیے باطل سے تعاون جائز ہو گیا ہے، بلکہ اس لیے کہ جب دو برائیوں میں سے کسی ایک برائی کا اختیار کرنا ناگزیر ہو جائے اور خیر کی راہ مسدود ہو جائے تو شریعت اور عقل کا فتویٰ یہی ہے کہ ایسی شکل میں اس برائی کو اختیار کیا جائے جو ہمارے اپنے نسب البین کے پہلو سے ہلکی ہو۔

مولانا غور فرمائیں کہ کہاں یہ اختیار اہمون البلیتین کا اصول اور کہاں نظام باطل کے ساتھ تعاون کا معاملہ؟ دونوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ اول تو یہ بات نہیں بھونی چاہیے کہ اہمون البلیتین کا اختیار کہ باصرف اس شکل میں جائز ہے جب کہ کوئی اور راہ خیر دو برائیوں کے سوا باقی ہی نہ رہ گئی ہو۔ نہ کہ اس وقت بھی کسی برائی ہی کو اختیار کر لیا جائے جبکہ ایک خیر کی راہ کھلی ہوئی ہو یا کھل سکتی ہو۔ دوسرے اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس شکل میں بھی اہمون برائی کو صرف اختیار کر لینے کی اجازت ہے نہ کہ اس کو اپنی قوتوں اور قابلیتوں سے پروان چڑھانے کی جس کو تعاون کہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مولانا نے حضرت یوسف علیہ السلام کا بھی حوالہ دیا ہے کہ انہوں نے بھی ایک نظام باطل کے ساتھ تعاون کیا تھا۔

اس سوال پر جماعت اسلامی کے لٹریچر میں انا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب کسی مزید بحث کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے لیکن معلوم نہیں کیوں لوگوں کو یہ ثابت کرنے پر اصرار رہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر نے اپنی قوتیں اور قابلیتیں نعوذ باللہ ایک طاغوتی نظام کو پروان چڑھانے میں صرف کیں جن لوگوں نے یہ بات کہی ہے اللہ تعالیٰ ان کو معاف

ملاحظہ ہر تہیات حصہ دوم مضمون حضرت یوسف اور غیر اسلامی حکومت کی ملکیت

کرے۔ انہوں نے ایک عظیم الشان پیغمبر پر بڑی سخت تہمت لگائی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات جو ہیں قرآن مجید اور تورات سے معلوم ہوئے ہیں ان سے تو یہ تپہ چلتا ہے کہ انہوں نے بھی اسی طرح ایک نظام باطل کو نظام حق میں تبدیل کرنے کی کوشش فرمائی جس طرح تمام انبیائے کرام علیہم السلام نے فرمائی بس فرق یہ ہے کہ بادشاہ وقت کی غیر معمولی عقیدت کی وجہ سے ان کو اُس کشمکش سے دوچار نہیں ہونا پڑا جس کشمکش سے دوسرے انبیائے کرام کو دوچار ہونا پڑا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خود کبھی بادشاہ مصر سے اس کی حکومت کے اندر کسی ملازمت یا کسی عہدہ کے لیے درخواست نہیں کی، بلکہ بادشاہ خود ان کے جیل کے حالات سن کر ان کا معتقد ہوا اور پھر ان سے ملاقات کر کے اور اپنے خواب کی حیرت انگیز تعبیر معلوم کر کے ان کا اس قدر گرویدہ ہوا کہ ان کو اپنا پیر و مرشد بنایا اور ان پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کر کے یہ اشارہ عرض کیا کہ وہ حکومت کی ذمہ داری قبول فرمائیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ دیکھ کر کہ ایک شخصی حکومت میں تمام امر و نہی کا مالک بادشاہ ہی ہوتا ہے، اور وہ کسی کا معتقد اور گرویدہ ہو جائے تو عملاً تمام سلطنت کی باگ اسی کے ہاتھ میں آجاتی ہے، یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ بادشاہ کی درخواست منظور فرمائیں اور اس طرح اس ملک کے نظام کو ایک نظام حق میں تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ بادشاہ کو اُس وقت سب سے بڑی فکر اس پیش آنے والے قحط کی دہانگیر تھی جس کو اس نے خواب میں دیکھا تھا اور جس کی اس کو حضرت یوسف نے اس کے خواب کی تعبیر کی شکل میں خبر دی تھی حضرت یوسف نے اسی خطرہ سے ملک کو نجات دلانے کا ارادہ کیا کہ یہ سب بڑی انسانی خدمت بھی تھی اور لوگوں کو اپنے فکر و عمل سے متاثر کرنے کی نہایت اچھی راہ بھی تھی۔ چنانچہ انہوں نے بادشاہ سے یہ کہا کہ اگر آپ کی حکومت کو میری امداد کی ضرورت ہے تو مجھے یہ اختیار دیا جائے کہ میں ملک کو قحط سے بچانے کے لیے ملک کے تمام ذرائع کو کنٹرول کر سکوں۔ بادشاہ نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا اور اپنی تمام مملکت میں یہ اعلان کر

دیا کہ وہ حضرت یوسفؑ کے تمام احکام کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے۔ چنانچہ اس طرح مملکت کی ساری باگ حضرت یوسفؑ کے ہاتھ میں آگئی۔ بادشاہ ان کو اپنا باپ کہتا تھا اور ان کے تمام احکام کی بے چون و چرا تعمیل کی جاتی تھی۔

اس واقعہ کو جو لوگ کفار کی کاسہ لسی اور طاغوتی نظاموں کی غلامانہ چاکری کے جواز کی دلیل ٹھہراتے رہے ہیں اور اب تک بار بار کی تفہیم کے باوجود اپنی اس حرکت سے باز نہیں آتے ان پر افسوس اور صدمہ ہزار افسوس۔ اگر کسی خوش بخت کو حضرت یوسفؑ کی طرح کسی نظام ہلال پر حاوی ہو کہ اس کو نظام حق میں تبدیل کرنے کی سعی کا موقع مل جائے تو وہ ضرور اس سے فائدہ اٹھائے اور انقلابی طریقے اختیار کرنے کے بجائے اسی طریق سے نظام کو تبدیل کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن یہ کیا بڑا فضولی ہے کہ گداکروں کی طرح در در نوکریوں کی بھیک مانگی جائے اور دعویٰ یہ کیا جائے کہ یہ اسوۂ یوسفی کی پیروی ہے!

جماعت اسلامی کے اس فتوے کے دو بڑے نقصانات مولانا نے بتائے ہیں:-
ایک یہ کہ اس فتوے کے سبب جماعت کے بہت سے ارکان کے نزدیک اُن علمائے دین کا ایمان ہی مشتبہ ہو جاتا ہے جنہوں نے غیر اسلامی حکومتوں کی نوکریوں کو جائز ٹھہرایا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کے سبب سے خواہ مخواہ کہ بہت سے ارکان جماعت گنہگار ہو رہے ہیں کیونکہ وہ اس فتوے کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے بھی سرکاری نوکریاں کر رہے ہیں اور وہ اپنے آپ کو مضطر قرار دیے ہوئے ہیں حالانکہ وہ مضطر کی تعریف میں نہیں آتے۔

مولانا نے اپنے دعوے کے پہلے حصہ کے ثبوت میں دو واقعے پیش کیے ہیں۔ ایک واقعہ ”جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے ایک دوست“ کے حوالہ سے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مرحوم کے متعلق ہے۔ اس واقعہ کو پیش کرنے کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ مولانا مرحوم کے مریدوں کو جماعت کے خلاف بھڑکایا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ جماعت کے اندر ایسے افراد موجود ہوں جو مولانا اشرف علی صاحب مرحوم کے متعلق بہت اچھی رائے نہ رکھتے ہوں یہ

بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی موقع پر اپنی اس رائے کا اظہار بھی کر گزرے ہوں۔ اس طرح کے افراد ہر جماعت میں ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ اور میں باور نہیں کر سکتا کہ خود مولانا کے گروہ میں دوسری جماعتوں کے بزرگوں کے متعلق اسی طرح کی رائیں رکھنے والے لوگ موجود نہ ہونگے۔ لیکن اس طرح کے انفرادی رجحانات کو کبھی پوری جماعت کے سر نہیں تھوپا جاتا۔ ہمارے نزدیک کسی جماعت کے اندر اس طرح کے لوگوں کا پایا جانا ذرا بھی عجیب نہیں ہے۔ البتہ یہ کیر کٹر کچھ بہت ہی عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص جماعت اسلامی سے اپنے آپ کو تعلق رکھنے والا بھی ظاہر کرے اور پھر وہ جماعت کے ارکان کے شخصی تاثرات کو جا جا کر مولانا محمد منظور صاحب سے بیان بھی کیا کرے۔ اور پھر کمال ہے مولانا کا کہ اس کی جاسوسی کی سو غایتیں قبول کر کے رکھتے جائیں اور جب جماعت کے خلاف کوئی مضمون لکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی سازگار موسم پیدا کر دے تو ان جمع شدہ معلومات کو ”جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے ایک دوست“ کے حوالہ سے مضمون میں درج فرمادیں۔ کیا مولانا پسند فرمائیں گے کہ ان کی تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو دوسرے بھی اسی طرح استعمال کرنا شروع کر دیں؟

مولانا کو چاہیے تھا کہ وہ اپنے ان ”دوست“ کو یہ نصیحت کرتے کہ بھائی، یا تو تم جماعت اسلامی کے ساتھ تعلق نہ قائم کرو، اور اگر تعلق رکھتے ہو تو جماعت کے افراد وقتاً فوقتاً دیر میں کے متعلق اپنے ذاتی تاثرات جو بیان کیا کریں ان کو نقل نہ کرتے پھر وہ یہ بات مجلسی آداب و روایات کے خلاف ہے اور اس سے مسلمانوں کے درمیان آپس کی بدگمانیاں پیدا ہوتی اور پھلتی ہیں۔ میں مولانا کو اس امر سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی باتیں دوسرے حلقوں سے متعلق ہمارے علم میں بھی آتی رہتی ہیں لیکن ہم ان کا نوٹس بھی نہیں لیتے۔ چہ جائیکہ ان کو اتنی اہمیت دیں کہ ان کو دلیل تبا کر ایک پوری جماعت کو مطعون کر ڈالیں۔

دوسرا واقعہ مولانا نے کسی پروفیسر صاحب یا ماسٹر صاحب کا نقل فرمایا ہے کہ وہ اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ کسی غیر اسلامی ریاست میں مجلس قانون ساز یا پارلیمنٹ کی کثیت

شُرک ہے اور ویسا ہی شرک ہے جیسے بت پرستی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے ہندوستان کی پارلیمنٹ کے ایک رکن کا، جو ایک مشہور غلام ملت ہیں، نام لیا اور اُن سے دریافت کیا کہ کیا آپ واقعہ ایسا سمجھتے ہیں کہ پارلیمنٹ کی رکنیت کی وجہ سے وہ اسلام سے بالکل خارج ہو چکے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا بے شک۔

اس میں شبہ نہیں کہ پروفیسر صاحب یا ماسٹر صاحب نے مولانا کو نہایت غلط جواب دیا۔ اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ سچا ہے ان مولویانہ معارضات سے ٹٹنا نہ جانتے تھے، اس وجہ سے غصہ میں آئے ایک ایسی بات کہہ گئے جو صحیح نہ تھی لیکن میں مولانا سے یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ خود اُن کا معارضہ پروفیسر صاحب کے جواب سے بھی زیادہ غلط ہے یہ طریقہ نہایت عامیانا ہے کہ ایک چیز کے صحیح ہونے کی دلیل کتاب و سنت کے بجائے زید و بکر کے عمل سے لائی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مسلمانوں کا نہایت ہمدرد ہو خواہ ہو لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا ہر فعل شریعت کے مطابق ہو۔ میر سید، حالی، چراغ علی، محسن الملک، مصطفیٰ کمال، امان اللہ خاں، محمد علی جناح، سب مسلمانوں کے نہایت ہمدرد ہو خواہ تھے لیکن کیا مولانا اس بات کے لیے تیار ہیں کہ ان کو مستقل دینی سند مان میں اور جو کچھ وہ کر گزرے ہیں اُس سب کو محض اس دلیل کی بنا پر جائز قرار دے دیں کہ ”مسلمانوں کا درد و فکر ان کے دل میں کسی دوسرے مدعی سے کم نہیں ہے“ یہ طرز استدلال قومیت پرست حلقوں میں تو بہت مقبول رہا ہے لیکن مولانا کے اس بیان سے یہ کھلا کہ یہی منطق ہمارے دیندار حلقوں میں بھی چل رہی ہے۔ سبحان اللہ!

مولانا نے دوسرا نقصان اس فتنے کا یہ بتایا ہے کہ اس کے سبب سے بہت سے مسلمان اور جماعت کے بہت سے ارکان گنہگار ہو رہے ہیں اس لیے کہ وہ سرکاری نوکریوں کو حرام تسلیم کرتے ہوئے محض اضطرار کے بہانے اختیار کیے ہوئے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ شریعت کے معاملہ میں بہانہ سازی نہایت مکروہ فعل ہے۔ جو لوگ دین

کے تقاضوں کو پورا نہیں کرنا چاہتے ان کو کسی نے مجبور نہیں کیا ہے کہ وہ خواہ مخواہ کو دینداری کا مظاہرہ کریں۔ اس زمانہ میں اگر کوئی شخص ایک نظام باطل کی نوکری کرے تو اہل دنیا بھی اس کو ترانگوں پر بٹھاتے ہیں اور اہل دین بھی اس کے اس فعل کو سنتِ یوسفی قرار دیتے ہیں۔ پھر کیا ضرور ہے کہ ایک شخص ایسے نفع کے کاروبار کو چھوڑ کر جماعتِ اسلامی کے چکر میں پھنسے! لیکن اگر کوئی شخص ہمارے دلائل سے مطمئن ہو کر اس راستہ پر آتا ہے تو اس کا ادین فرض یہ ہے کہ وہ خدا کے ساتھ چابازی نہ کرے۔

یہ ہمارا مشورہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی مشورہ مولانا کو بھی ان دوستوں کو دینا چاہیے جو جماعت کے اس مسلک کو ترمیم سمجھتے ہیں اور اس کو صحیح سمجھتے ہوئے ہی جماعت میں داخل ہوئے ہیں، لیکن اس مسلک پر عمل کرنے میں دیانتدار نہیں ہیں۔ لیکن مولانا ان کو مشورہ دینے کے بجائے خود ہمیں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ چونکہ جماعت کے بعض ارکان جماعت کے اس مسلک پر دیانتداری کے ساتھ عمل نہیں کر رہے ہیں اور اس کے سبب سے گنہگار ہو رہے ہیں اس لیے صائب رائے یہی ہے کہ تم اپنا مسلک ہی بدل ڈالو۔

ایک نیک نیت آدمی کو اس پر کچھ اچنبھا سا ہو گا کہ مولانا نے یہ کیا بات فرمادی! لیکن میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سوچنے کا یہ انداز کچھ مولانا ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ادھر زوال کی صدیوں میں ہمارا جو علم فقہ مرتب ہوا ہے وہ زیادہ تر اسی طرز کی ذہنیت کی پیداوار ہے۔ مسلمانوں کی سوسائٹی جس رفتار سے بگڑتی گئی ہے، اور زندگی کے مختلف گوشوں میں شریعت سے انحراف جس قدر بڑھنا گیا ہے، مسلمانوں کی بگڑی ہوئی زندگی کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کے لیے ہمارے علماء حضرات شریعت کے تقاضوں میں اسی نسبت سے چھانسی کرتے چسے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ شرک و توحید کا فیصلہ بھی اب قرآن و حدیث کے بجائے ہندوستان کی لاوین پارلیمنٹ کے بعض ارکان کے طرزِ عمل سے ہونے لگا ہے۔ آخر

اکرام مسلم کا ضابطہ کوئی معمولی چیز تھوڑا ہی ہے د

مولانا نے اس بحث کو ختم کرتے ہوئے ایک بڑی ہی دلچسپ بات ارشاد فرمائی ہے جو ان کے پچھلے تمام ارشادات پر بازی لے گئی ہے۔ فرماتے ہیں:-

”میرے نزدیک اس مسئلے کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اگر کسی جماعت کے دو چار مسئلے بھی جمہوری مسلمانوں سے الگ ہوں تو کچھ دنوں کے بعد اس کا ایک مذہبی فرقہ بن جانا بالکل یقینی ہے۔ اگر بالفرض جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی عالم کی ذاتی تحقیق یہی ہے تو رہے لیکن رکن جماعت ہونے کے لیے اس مسئلے پر ایمان لانے کو شرط قرار دینا تو عرصہ چار اپنے متبعین اجتہاد کا ایک فرقہ بنانا ہے۔“

جماعت کے مخالفین ملت سے اس فکر میں تھے کہ اس جماعت کو کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کے اندر ایک مذہبی فرقہ بنا ڈالیں۔ لیکن انہیں اس کے لیے کوئی معقول بنیاد نہیں مل رہی تھی۔ مولانا کی ذہانت قابلِ داد ہے کہ انہوں نے کم از کم ایک بنیاد تو تلاش کر کے فراہم کر دی! اس کے لیے مولانا ہمارے تمام مخالفین کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔

مگر مولانا اجازت دیں تو ہم ان سے گزارش کریں گے کہ وہ اس کے ساتھ لگے ہاتھوں چند اشتاد پر اور روشنی ڈال دیں:-

پہلا سوال یہ ہے کہ اگر کسی مسئلے یا چند مسائل میں کتاب و سنت کی دلیل سے ایک حکم شرعی بیان کرنے اور اس کے اتباع پر چند لوگوں کے جمع ہو جانے سے ایک مذہبی فرقہ بن جاتا ہے تو مولانا کے نزدیک اُس فرقے کی نوعیت کیا ہے؟ آیا یہ وہی تفرقہ فی الدین ہے جس سے قرآن میں منع کیا گیا ہے؟ یا یہ ان اختلافات میں سے ہے جن کے جواز کی اس دین میں گنجائش پائی جاتی ہے؟ اگر مولانا کے نزدیک یہ تفرقہ فی الدین ہے تو ان بزرگوں کے بارے میں مولانا کی کیا رائے ہے جنہوں نے دو چار مسئلوں میں نہیں، ہزار مسائل میں اپنے اجتہاد سے احکام شرعیہ مرتب کیے اور ان میں سے ہر ایک کے اتباع پر لاکھوں کروڑوں مسلمان جمع ہو کر الگ الگ گروہ بن گئے؟ کیا یہ سب تفرقہ فی الدین کے محرم تھے؟ اور اگر مولانا اس فعل کو جائز اختلافات میں شمار فرماتے

ہیں، تو براہ کرم وہ ارشاد فرمائیں کہ جو چیز اگلوں کے لیے جائز تھی وہ پھلوں کے لیے کس دلیل سے حرام ہو گئی؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ ”جمہور مسلمانوں“ سے مولانا کی مراد کیا ہے؟ اگر اس سے مراد عوام ہیں، تو میں عرض کروں گا کہ آج مسلم عوام کی بہت بڑی اکثریت اُن عقائد اور اعمال میں مبتلا ہے جن کو خود مولانا محمد منظور صاحب مشرکانہ عقائد اور مبتدعانہ اعمال کہتے رہے ہیں اور اب تک کہتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں قرآن و حدیث سے استدلال کر کے وہ عقیدے اور عملی طریقے پیش فرماتے ہیں جو ان کے نزدیک اصل شرعی مسئلے ہیں۔ پھر آپ کا ایک مذہبی فرقہ بن جاتا کیوں یقینی نہیں ہے؟ اور اگر آپ کی مراد جمہور علماء ہیں، تو براہ کرم مولانا کسی ایک ایسے عالم کا نام لیں جو عقیدہ توحید کی اُس تشریح کا منکر ہو جو ہم نے اپنے عقیدے کے پانچویں فقرے میں بیان کی ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ ہم نے اپنے دستوریں رکن جماعت ہونے کے لیے ایمان کس چیز پر لانے کو شرط قرار دیا ہے؟ مذکورہ بالا عقیدے پر، یا اس کے مقتضائے مطابق عمل کرنے پر؟ ظاہر ہے کہ ہمارا مطالبہ عقیدے پر ایمان لانے کا ہے نہ کہ عمل پر۔ عمل تو اس عقیدے کے منطقی نتائج اور لوازم میں سے ہے، اس لیے ہم نے اسے شرط نہ کنیت ٹھہرایا ہے۔ لیکن مولانا نے یہ کہہ کر صریح مغالطہ دیا ہے کہ ہم لوگوں سے اُس مسئلے پر ایمان لانے کا مطالبہ کر رہے ہیں جس پر عمل کرنے کو ہم نے شرط نہ کنیت قرار دیا ہے تاکہ اس سے آسانی یا نتیجہ نکالا جاسکے کہ جو شخص اس پر عمل نہیں کرتا وہ ہمارے نزدیک کافر ہونا چاہیے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس طرح کے مغالطوں سے خلق خدا کو دھوکا دینا اور اپنے جیسے چند خادمانِ دین کو بدگمانیوں کا پداف بنانا آپ کے لیے کیسے جائز ہو گیا؟ یہ کیسا نفوی ہے؟ یہ کیسی فکرِ آخرت ہے؟ یہ کس قسم کا تزکیہ نفس ہے جس کی مشق آپ پچھلے دس سال میں کرتے رہے ہیں؟

چند ندرین مشورے

یہاں تک ہم نے جماعت اسلامی سے متعلق مولانا کے تاثرات کا جائزہ لیا ہے۔ مولانا نے ان تاثرات کے ماتحت ازراہ کم جماعت کو چند ندرین مشورے بھی دیے ہیں جن پر اگر عمل کیا جائے تو مولانا کے خیال کے مطابق وہ غرابیاں دور ہو جاسکتی ہیں جن کی طرف مولانا نے اشارہ فرمایا ہے۔ ہمارے لیے اس مضمون کا سب سے زیادہ اہم حصہ یہی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس کی نسبت بھی اپنے خیالات ظاہر کر دیں۔

(۱) مولانا کا پہلا مشورہ یہ ہے کہ جماعت کے لٹریچر پر نظر ثانی کے لیے ایک کمیٹی بٹھائی جائے جو ان اعتراضات کو سامنے رکھ کر، جواب تک سامنے آچکے ہیں، پورے لٹریچر کا جائزہ لے اور ان چیزوں کو لٹریچر سے خارج کر دے جو لوگوں کے نزدیک قابل اعتراض ہیں۔ اس کمیٹی کی تشکیل کے متعلق مولانا کی رائے یہ ہے کہ اس میں ایک نمائندہ جماعت اسلامی کا ہو اور ایک نمائندہ باہر کا ہو۔ مولانا کی یہ تجویز بظاہر بڑی مصدمانہ نظر آتی ہے، لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ مولانا نے اس کو پیش کرنے سے پہلے شاید پانچ منٹ بھی اس پر غور کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی ہے۔ اور اگر انہوں نے اس تجویز پر غور کر کے اس کو پیش کیا ہے تو ان کے غور و فکر کے متعلق کوئی شخص اچھی رائے نہیں قائم کر سکتا۔

جماعت اسلامی کا لٹریچر بیشتر مولانا مودودی صاحب کی کتابوں پر مشتمل ہے۔ مودودی صاحب کوئی اکیڈمک طرز کے مصنف نہیں ہیں کہ انہوں نے مجرد علمی خدمت کے لیے زندگی سے غیر متعلق مسائل پر غامض فرسائی کی ہو۔ وہ کوئی ناقل قسم کے آدمی بھی نہیں ہیں کہ ایک خاص مسلک کی عربی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کو اپنے الفاظ میں اردو میں منتقل کر دیتے ہوں۔ وہ کوئی جامد اور متقلد قسم کے آدمی بھی نہیں ہیں کہ ان کا سارا تصنیفی کارنامہ صرف مکھی پر مکھی مار دینا ہو۔ وہ دین و دنیا کی تفریق کے دہم میں بھی مبتلا نہیں ہیں کہ ان کا سارا تہذیب و فہم غل و غل کے مسائل تک محدود ہو۔ وہ ایک داعی اور مصلح کی شان رکھتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں دعوت و اصلاح کے مقصد کو سامنے رکھ کے لکھتے ہیں۔

اس مقصد کی خاطر انہوں نے دین کی متعدد ایسی حقیقتوں کو بر ملا آشکارا کیا ہے جو اگرچہ دین کی نہایت ثابت اور معروف حقیقتیں رہی ہیں لیکن اس دور زوال میں ان کو اس وضاحت کے ساتھ کہنے کی ہمت لوگ کھو بیٹھے تھے۔ اس اصلاح کے مقصد کی خاطر ان کو صرف مسلمانوں کے گمراہ فرقوں ہی پر نہیں بلکہ ان نقہی گروہوں پر بھی تنقیدیں کرنی پڑی ہیں جو صحیح بنیاد پر ہونے کے باوجود بہت سی بے اعتدالیاں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہیں لوگوں سے بھی ٹرنا پڑا ہے جو بیجا تعصبات اور تقلید جاد کی بندشوں میں گرفتار ہیں۔ انہیں دین کے صحیح تصور اور اس کے نظام کے احیاء کی خاطر ان لوگوں سے بھی نبرد آزمانی کرنی پڑی ہے جو موجودہ معاشرے کی قیادت کر رہے ہیں۔ الغرض انہوں نے جب سے قرعہ عاس و ظلم کا مشغلہ اختیار کیا ہے ان کو اپنے گرد پیش سے ایک چومکھیا لٹائی لٹنی پڑی ہے۔ تنفی اور اہل حدیث، دیوبندی اور بریلوی، صوفی اور تلامذہ، مقلد اور غیر مقلد، شیعہ اور قادیانی، منکر حدیث اور منکر شریعت، نیشنلسٹ اور کمیونسٹ، کانگریسی اور مسلم لیگی، غرض کوئی ایسا نہیں ہے جس پر ان کو تنقید نہ کرنی پڑی ہو اور وہ ان کے ٹر پیچھے کسی نہ کسی حصہ سے پیڑا نہ ہو۔ پھر جی نہیں کہ انہوں نے ان لوگوں پر تنقید کی ہے بلکہ اپنے خیال کے مطابق ایک مثبت پروگرام بھی پیش کیا ہے جس پر چل کر، ان کے خیال میں مسلمانوں کی حالت درست کی جاسکتی ہے اور اسلام کو از سر نو بحیثیت ایک نظام زندگی کے برپا کیا جاسکتا ہے۔ ایک ایسے مصنف کی کتابوں پر نظر ثانی کے لیے اگر اس طرح کی کمیٹی بٹھائی جائے جس طرح کی کمیٹی مولانا نے تجویز فرمائی ہے تو اس سے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکے گا کہ دیوبندی حضرات کا (بشرطیکہ کمیٹی کا دوسرا نمائندہ دیوبندی ہو) غصہ جماعت کے خلاف کچھ کم ہو جائے گا۔ باقی رہیں دوسری تمام جماعتیں جو مودودی صاحب کی تنقیدات کے زخم خوردہ ہیں وہ تو بدستور نالاں سی رہیں گی۔ اور اگر ان تمام گروہوں کو خوش کرنے کے لیے ہر جماعت کا ایک ایک نمائندہ یا جائے تو یہی مولانا کو یقین دہانہ ہوں کہ مودودی صاحب کے موجودہ ٹر پیچھ کا کوئی حصہ نہ صرف یہ کہ بچ نہیں رہے گا بلکہ ان سب کے کوٹھنگے سے بھی دھسے کے جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔

مولانا نے اس سلسلہ میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مرحوم کا ذکر فرمایا ہے کہ انہوں نے اس علم و تجربہ کے باوجود ایک عالم کو اپنے پاس سے ایک بڑی تنخواہ دے کر اپنی کتابوں پر نظر ثانی کرائی اور اس نظر ثانی کے نتیجہ کے طور پر اپنی بہت سی رایوں سے رجوع کر لیا اور بہت سی عبادتوں بدل ڈالیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ مولانا تھانوی مرحوم نے یہ کام بہت اچھا کیا۔ ہم بھی مولانا مودودی صاحب کو یہ مشورہ دیں گے کہ اگر انہیں بھی کوئی ایسا شخص میسر آجائے جو ان کی کتابوں پر نظر ثانی کر سکے تو ایک بڑی تنخواہ دے کر ہی یہی وہ بھی اپنی کتابوں پر نظر ثانی کرا ڈالیں۔ لیکن میں مولانا منظور صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ اس قسم کی نظر ثانی ایک مقررہ کو بھی مطمئن نہ کر سکیگی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مولانا تھانوی نے جو نظر ثانی اپنی کتابوں پر کرائی اس کے باوجود ان کے مفسرین نے اپنا فتوہ کفر واپس نہیں لیا۔ ان کو مطمئن کرنے کی شکل تو صرف یہ تھی کہ ترویج الراج کی تیاری میں مولانا احمد رضا خاں صاحب مرحوم کو بھی برابر کا حصہ ملتا۔ لیکن کیا مولانا بتا سکتے ہیں کہ جس طرح مولانا جماعت اسلامی کے ٹریچر پر نظر ثانی کرنے والی کمیٹی میں پچاس فیصدی نمائندگی اس کے مخالفین کو دلوا رہے ہیں اسی طرح مولانا تھانوی مرحوم نے بھی کوئی کمیٹی بنائی تھی جس میں پچاس فیصدی نمائندگی بریلوی حضرات کو دی ہو؟

پھر اگر یہ نسخہ اتنا ہی سستا تھا تو مولانا اسماعیل شہید کی تقویت الایمان وغیرہ پر کیوں نظر ثانی کرائی گئی؟ اور جب دیوبند کے خلاف امکان کذب باری وغیرہ پر کفر کے فتوے نکلے تھے تو کیوں نہ اکابر دیوبند کی کتابیں ایک کمیٹی کے حوالہ کی گئیں جس میں بریلی کو بھی پچاس فیصدی نمائندگی دی گئی ہوتی؟

یہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ مولانا کی نادر تجویز پر تبصرہ تھا۔ باقی رہا اصل مسئلہ تو میں مولانا کو یقین دلاتا ہوں کہ مودودی صاحب پر اگر ان کی کوئی غلطی و لامل سے واضح کر دی جاتی ہے تو اس کے تسلیم کر لینے میں ان کو ذرا بھی تاثر نہیں ہوتا ہے۔ خود مولانا محمد منظور صاحب کو

بھی تجربہ ہوگا کہ اب سے دس سال پہلے انہوں نے "حقوق الزینین" کی ایک عبارت کی طرف مولانا مودودی کو توجہ دلائی اور انہوں نے "ترجمان القرآن" میں اعلان کر کے اس عبارت سے رجوع کیا۔ ابھی حال کی بات ہے کہ اپنی کتاب "سود" کی ایک پوری فصل انہوں نے اپنی ایک غلطی پر متنبہ ہو کر بدل ڈالی اور اس کا اعلان کر دیا۔

ایک ذہین اور نیک نیت آدمی کی نظر میں اپنی رائے کی کتنی ہی اہمیت ہو لیکن جب وہ اپنی کسی غلطی پر متنبہ ہو جاتا ہے تو اس کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ مولانا مودودی کو بھی اگر ان کی غلطیوں پر متنبہ کیا جائے تو جیسا کہ انہوں نے خود اعلان کیا ہے وہ اپنی کسی غلطی پر اصرار نہیں کریں گے۔ لیکن یہ بات تو کچھ بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ وہ مولوی مل کہ ان کی کتابوں کی پڑتال کریں اور یہ بتائیں کہ انہوں نے کہاں کہاں غلطی کی ہے اور کہاں کہاں صحیح لکھا ہے! اگر اس قابلیت کے وہ مولوی صاحبان ہمارے ملک میں موجود ہیں تو وہ مودودی کی کتابوں پر نظر ثانی کی کھکھیر اپنے سر کیوں ہیں؟ وہ خود ہی لوگوں کو کتابیں لکھ کر کیوں نہ بتائیں کہ صحیح دین یہ ہے جو وہ بتاتے ہیں نہ کہ وہ جو مودودی صاحب بتا رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ ان کو جبرائے خیر دیگا۔ وہ میدان میں نکلیں تو سہی۔ یہ علم و فضل رکھتے ہوئے آخر وہ چھپے کیوں بیٹھے ہیں جبکہ خلق خدا اگر اہ بوئی جا رہی ہے! (۲) مولانا کا دوسرا مشورہ یہ ہے کہ سلف صالحین کے ساتھ مسلمانوں کو جو تعلق و وابستگی اور ان کے علم و دین پر جس درجہ کا اعتماد اس زمانے کے مسلمانوں کو ہونا چاہیے جماعت میں اس کو پیدا کرنے کا خاص اہتمام کیا جائے۔

مولانا نے یہ بات فرمائی تو مشورہ کے رنگ میں ہے لیکن ہے یہ درحقیقت جماعت پر ایک بڑی تہمت۔ مولانا کے اس ارشاد کا صاف مطلب یہ ہے کہ جماعت اپنے لڑ بچر کے ذریعے سے مسلمانوں کے دلوں سے سلف صالحین کے احترام کی جڑیں اکھاڑ رہی ہے، اس فتنہ کا سیلاب ہونا چاہیے اور اس کی جگہ پر اس بات کا اہتمام ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کو سلف صالحین سے

عقیدت پیدا ہو۔

مولانا کے اس مشورہ کا تو ہم احترام کرتے ہیں لیکن اس میں جو غلیظ قسم کی تہمت چھپی ہوئی ہے اس کو ہم اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس کی تمام بے بنیاد اور جھوٹی تہمتیں درحقیقت مستحق ہیں مسلمانوں کے دلوں میں سلف صالحین کا جو احترام از روئے کتاب و سنت ہونا چاہیے وہ تو ہمارے دل میں ہے اور اسے ہم پیدا بھی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جو احترام از روئے کتاب و سنت خدا اور اس کے رسولوں کے سوا کسی اور کا نہ ہونا چاہیے اس سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں اور مسلمانوں کو بھی اس سے بچانا چاہتے ہیں۔ مولانا بسا کہ کم پہلے یہ بتائیں کہ سلف صالحین سے تعلق و وابستگی اور ان کے علم و دین پر اعتماد کے صحیح اسلامی حدود کیا ہیں؟ پھر ہم ان سے پوچھیں گے کہ ہم نے ان حدود سے کب اور کہاں تجاوز کیا ہے؟

سلف صالحین کا احترام پیدا کرنے کے لیے یہ نہایت ہی احمقانہ طریقہ ہے کہ بلید الذہن لوگ ان کی طرف ایسی لابیائی باتیں منسوب کریں جن کا کوئی عاقل تصور بھی نہ کر سکتا ہو اور پھر اصرار کیا جائے کہ ان باتوں کو سلف صالحین کی خاطر مان لیا جائے۔ حال ہی میں ایک پیرزادہ صاحب نے مجدد صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ کا نام لے کر تصویب شیخ کی ایک نہایت گھناؤنی تو جیسیٹ فرمائی جو ہر مسر ضلالت تھی۔ کیا حضرت مجدد صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ کی عزت و عظمت اسی طرح کی باتوں سے مسلمانوں کے دلوں میں میٹھے گی؟ پھر میں نے پیرزادہ صاحب کے پیش کردہ تصویب شیخ کے چہرہ سے نقاب اٹھایا تو مولانا منظور صاحبؒ اٹھے میرے ہی سر ہو گئے کہ تو نے تو مجدد صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ کو مشرک و کافر بنا ڈالا! میں مولانا سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا انہی باتوں کو آپ اپنے اسلاف کی طرف منسوب کر کے ان کے ناموں کو روشن کرنا چاہتے ہیں؟ اگر مولانا منظور صاحب کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ ہم بھی انہی طریقوں سے مسلمانوں کے دلوں میں اسلاف کا احترام پیدا کریں جس طرف انہوں نے رہنمائی کی ہے تو میں صاف عرض کیے دیتا ہوں کہ ہم اس سے معذوریں۔ ان طریقوں سے اسلاف کی عزت و عظمت تو معلوم نہیں دلوں میں پیدا ہوگی یا نہیں البتہ دین کی جڑیں اکھاڑنے کی جو کوشش یہ جالے مفتیان دین کر رہے ہیں اس میں کوئی کسر نہیں رہ جائے گی۔ آخر اس سے بڑھ کر

اس دین کے لیے نقصان دہ چیز اور کیا ہو سکتی ہے کہ قرآن اور حدیث اور صریح عقل کے خلاف باتیں بزرگوں کی طرف نسبت کر کے پیش کی جائیں اور پھر بزرگوں کے نام کا واسطہ دیکر لوگوں سے ان کے ماننے کا مطالبہ کیا جائے۔

(۳) مولانا کا تیسرا مشہور یہ ہے کہ جماعت کے حلقے سے باہر علم دین کی حامل جو شخصیتیں واجب الاحرام اور نابل استفادہ ہوں ان کے احترام اور ان کے محاسن کی قدر و عظمت کی مشق کی جائے اور شکاری کمیونسٹوں کی طرح صرف اپنے نظریات کی تبلیغ ہی کے ارادہ سے نہیں بلکہ دین و ایمان کے رشتہ سے استفادہ کی نیت سے ان کی خدمت میں حاضری دی جائے۔

نیں مولانا کو یقین دلانا ہوں کہ جہاں تک علم اور دین کی حامل شخصیتوں کے احترام اور ان سے استفادہ کی خواہش کا تعلق ہے ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں اور بغیر کسی مشق کے یہ چیز ہمارے اندر موجود ہے۔ اہل علم اور اہل اخلاص سے محبت تکلف نہیں پیدا کی جاتی اور نہ اس کے لیے کسی دیانت اور ورزش کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بلکہ معقول آدمیوں میں یہ چیز خود بخود ہوتی ہے۔ ہم جن لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے مفید پاتے ہیں ان سے سبقت کر کے خود ملتے ہیں اور جب ملتے ہیں تو کھلے دل سے ملتے ہیں اور استفادہ و افادہ دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہیں۔ مولانا مودودی نے آپ کے شیخ مولانا محمد ایاس صاحب مرحوم کی خدمت میں سفر کر کے دو مرتبہ حاضری دی۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جماعت کے ذمہ داروں میں جماعت سے باہر کے لوگوں کا احترام اور ان کی قدر کا جذبہ نہیں ہے؟ اور کیا آپ ایمان داری کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا مودودی کمیونسٹوں کی طرح اپنے کچھ من گھڑت نظریات دے کر مولانا ایاس صاحب مرحوم کو شکار کرنے گئے تھے؟ میں نے بھی ایک مرتبہ مولانا ایاس صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضری دی ہے اور مجھے یاد آتا ہے کہ اُس موقع پر مولانا منظور صاحب بھی موجود تھے۔ کیا مولانا فرما سکتے ہیں کہ میں نے کوئی کوشش کمیونسٹوں کی طرح ان کو شکار کرنے کی کی؟ تقسیم سے پہلے مجھے کبھی یو۔پی جانے کا اتفاق ہوا میں نے برٹی میں اُتر کر مولانا سے ملنے کی ضرورت کو پیش کی۔ کیا مولانا کہہ سکتے

ہیں کہ اخلاص اور محبت کے سوا کوئی اور چیز میرے اترنے کا باعث ہوئی اور کیا میں نے کمیونسٹوں کی طرح اُن کو چھانسنے اور شکار کرنے کی کوئی کوشش کی؟۔ اگر ان سوالوں میں سے کسی سوال کا جواب بھی اثبات میں نہیں ہے تو کیا میں مولانا سے عرض کر سکتا ہوں کہ یہ فقرہ محض اس لیے انہوں نے لکھ دیا کہ زبانِ فلم پر "شکار کی کمیونسٹوں" کی جو چھپتی آگئی تھی اس کی اپنے ناظرین سے داد لینے کی خواہش کو مولانا دبانے کے!۔ کیا یہی وہ احتیاط و تقویٰ ہے جس کا مولانا نے اپنے مضمون کے شروع میں حوالہ دیا ہے؟۔ کیا واقعی ہم کمیونسٹوں کی طرح کچھ اپنے نظریات رکھتے ہیں جن کا خدا اور رسول کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ہمارے اپنے من گھڑت ہیں؟ کیا سچ پر ہم بھی کمیونسٹوں کی طرح خلقِ خدا کا شکار کرتے پھر رہے ہیں؟ کیا واقعی اپنی جماعت سے باہر کسی عالمِ دین یا خادمِ دین کا نہ ہم نے اترام کیا ہے اور نہ اس سے استفادہ کرنا پسند کیا ہے؟ اور کیا واقعی خود مولانا کے دل میں بھی اپنے گرو کے سوا کسی دوسرے کے علم و دین کا کوئی اترام موجود ہے جبکہ اپنی تبلیغ کو تو وہ سمجھتے ہیں تبلیغِ دین اور دوسروں کی تبلیغ کو وہ قرار دیتے ہیں شکار؟

اگر مولانا برائے نامیں تو میں ذرا اُن سے ایک بات دریافت کر لوں؟ وہ یہ کہ آخر آپ حضرات نے خود اپنے آپ کو دوسروں سے استفادہ کرنے کی ضرورت سے کیوں بالائے سمجھ لیا ہے؟ اگر آپ لوگوں کے پاس کوئی خدا کا بندہ دین کے تقاضے سمجھانے یا کوئی صلح لٹرچر پیش کرنے کے خیال سے چلا جائے تو پیشانیوں پر بل آجاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ کمیونسٹوں کی طرح ہمارا شکار کرنے آیا ہے؟ کیا دوسروں کی صحبت سے یا ان کے لٹرچر سے فائدہ اٹھانا آپ حضرات کے لیے شریعت میں حرام ہے؟ کیا آپ حضرات اپنے حلقہ سے باہر کسی کو اس کا اہل نہیں پاتے کہ اس سے دین کے تقاضے سمجھیں اور اپنی کمزوریوں کو دور کریں؟ دوسروں کو جو نصیحت آپ اس شد و مد سے فرماتے ہیں ذرا اپنوں کو بھی تو یہ مفید بات سمجھانے کی کوشش کیجیے۔ لیکن

کیا اثر صرف ہمارے ہی لیے اکبر نہیں ہے، بلکہ آپ حضرات کے لیے بھی ان شاء اللہ ناخ

رمیگا! اور کچھ نہیں تو وہ غور و غور نفس ہی کھٹکے گا جس کا ہمارے آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا بھر

کو آپ کے آئانوں پر استفادہ کے لیے آنا چاہیے مگر آپ کو کہیں استفادہ کے لیے جانے کی ضرورت نہیں۔

(۴) چوتھا مشورہ یہ ہے کہ دین کے جو اور کام ہیں مثلاً مدارس وغیرہ ان کی تحقیر سے بچ جائے۔ یہ مشورہ بھی ہے تو مشورہ کی شکل میں لیکن دراصل یہ طبعی جماعت پر ایک صریح تہمت اور بہتان ہے۔ بظاہر یہ مشورہ پیش کرنے کی وجہ اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتی کہ مولانا نے جتنے چلتے چاہا کہ ایک بدگمانی دینی درسگاہوں کے معلموں اور متعلموں کے دلوں میں بھی پیدا کر دیں کہ جماعت اسلامی والے تنہا ہی بھی تحقیر کرتے رہتے ہیں۔ جماعت اسلامی دینی مدرسوں کی تو درکنار خالق ہوں کی بھی تحقیر پسند نہیں کرتی۔ ہم سارے نظام تعلیم کو کتاب و سنت کی بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے لڑ رہے ہیں اور جب تک ہمیں اس مقصد میں کامیابی نہیں ہو جاتی اس وقت تک جس جگہ بھی دینی تعلیم کی کوئی خدمت ہو رہی ہے ہم اس کی دل سے قدر اور اس کے کارکنوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا بڑا اصرار ہے کہ ہمارے پاس جس قسم کے بھی دینی مدارس تھے پاکستان ان سے بھی محروم ہو گیا۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ جب تک ہمارے نصب العین کے مطابق نظام تعلیم میں تبدیلی نہیں ہو جاتی اس وقت تک عارضی طور پر کم از کم ویسی ہی درسگاہیں قائم کی جائیں جو عام عیال کے مولوی ہی پیدا کرتی رہیں۔ مگر دینی تعلیم کے موجودہ نظام پر ہماری طرف سے کچھ کہا گیا ہے تو اس کا مقصد اصلاح کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اگر کوئی شخص اس کو تحقیر پر محمول کرتا ہے تو یہ اس کے ذہن کی افتاد ہے۔ تحقیر نہ ہمارے پیش نظر کبھی رہی ہے نہ کبھی رہے گی۔

(۵) پانچواں مشورہ مولانا نے یہ دیا ہے کہ لکھنے میں ظن و تعریض اور تحقیر و تذلیل کا وہ رویہ جسے آج کل رسالہ نگاروں اور اخبار نویسوں نے بالکل حلال بلکہ کمال سمجھ لیا ہے اس کو یکسر ترک کیا جائے۔

یہ مشورہ بھی جماعت پر ایک تہمت ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جماعت کا کوئی شخص کبھی اپنے کسی مضمون میں ظن و تعریض کا استعمال ہے اعتبار الی کے ساتھ کہ گذرا ہو۔ لیکن جس شخص نے بھی آج کل

کے رسالہ نگاروں اور اخبار نویسوں کی تحریریں دیکھی ہیں اور اس کے ساتھ جماعت اسلامی کے اہل قلم کی تحریریں کو بھی پڑھا ہے وہ ایمان داری کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی طرز کے لکھنے والے ہیں۔ آج کل کے اخبار نویس اور رسالہ نگار نو درکنار، میں کہتا ہوں کہ آج کل کے فتویٰ نویس تک، اور وہ فتویٰ نویس جن کی حیثیت محض مفتیان کرام ہی کی نہیں بلکہ ماہرین نزکیہ نفس کی بھی ہے، اپنی تحریروں میں، اس احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھتے جو جماعت اسلامی کے معمولی اہل قلم ملحوظ رکھتے ہیں۔

میں خیال کرتا ہوں کہ مولانا کو اعتراض طنز و تعریض کی بے اعتدالی ہی پر ہو گا۔ کہ نفس طنز و تعریض پر کیونکہ جہاں تک نفس طنز و تعریض کا تعلق ہے اس کے جواز کے ثبوت کے لیے یہ کیا کم ہے کہ اس کی نہایت واضح مثالیں خود مولانا کے اس مضمون ہی میں موجود ہیں جس میں ہم کو طنز و تعریض سے بچتے رہنے کی نصیحت فرمائی گئی ہے۔ میں یہاں مولانا کے چند بے پردہ طنز کی مثالیں پیش کرتا ہوں اور میرا مقصود ان مثالوں کے پیش کرنے سے ہرگز مولانا کو اتنا ہی جواب دینا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ جو لوگ طنز و تعریض اختیار کرنا چاہیں وہ مولانا کی ان معصوم طنز بات کو اپنے لیے نمونہ بنا سکیں۔ جماعت کے ٹریچر پر مولانا ان الفاظ میں طنز فرماتے ہیں :-

”ابھی تک جماعت کے ذمہ داروں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی ہے اور الماریاں بھر دینے والا ٹریچر بھی ان کے تذکرہ سے خالی ہے“

جماعت کے عام ارکان پر مولانا کی یہ پھینٹیاں ملاحظہ ہوں :-

”آپ حضرات کے ان سیکرٹوں اور سبزلوں متبعین پر جو دین کے ہر شعبہ میں آپ ہی حضرات کو علم و تحقیق کا خاتم سمجھتے ہیں“

”تو آپ کے ٹریچر کے تیار کیے ہوئے بہت سے ”محققین“ و ”مجتہدین“ پوری دنیا کی کے ساتھ ان کے بدعت و ضلالت اور غیر اسلامی ہونے کا فتویٰ صادر کر دیں گے۔“

”لیکن آپ حضرات کے وہ سر جنہوں نے اسلام کی روح اور اس کے قالب کے بارہ میں

سارا علم آپ حضرات کے مقالات و مضامین ہی سے حاصل کیا ہے۔
 ”اردو کے چند رسالے پڑھ کر آپ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ دین کا پورا علم
 آپ کو حاصل ہو گیا ہے۔“

”اور شکاری کمیونسٹوں کی طرح صرف اپنے نظریات کی تبلیغ ہی کے لیے نہیں بلکہ دین و
 ایمان کے رشتہ سے — اور استفادہ کی نیت سے ان کی خدمت میں حاضری دی جائے۔“
 میں نے محض بطور مثال یہ چند نمونے پیش کر دیے ہیں۔ موانا کے مضمون میں اس طرح کی
 بے ضرر اور معصومانہ طنز و مزاح کی بہت سی مثالیں مل سکیں گی۔ اہل قلم بے دھڑک ان کی پیروی کر
 سکتے ہیں۔

۴) مولانا کا آخری مشورہ یہ ہے کہ عام و خاص مسلمانوں کے ساتھ تعلق و برتاؤ میں وہ طرزِ عمل
 اختیار کیا جائے جس پر مولانا محمد یاس صاحب مرحوم نے اپنی تبلیغی دعوت میں ”اکرامِ مسلم“
 کے عنوان سے انتہائی زور دیا ہے۔

اس مشورے کی ضرورت مولانا نے کیوں محسوس فرمائی؟ یہ سوال لائقِ غور ہے۔ غالباً مولانا
 یہ تو نہیں فرما سکتے کہ وہ جماعتِ اسلامی کے لوگوں کو ہر جگہ، ہر محفل اور ہر بازار میں ”عام مسلمانوں“
 کی توہین و تذلیل کرتے دیکھ رہے تھے اس لیے آخر تنگ آکر انہیں یہ مشفقانہ نصیحت کرنی پڑی۔
 اور شاید وہ یہ بھی نہیں فرما سکتے کہ کچھ ”خاص مسلمانوں“ سے ہم رات دن مار پیٹ اور گالم گلوچ کرنے
 میں مشغول تھے جسے ناقابلِ برداشت پا کر آخر کار مولانا کو ہم سے یہ کہنا پڑا کہ بھائی، اکرامِ مسلم کا
 شیوہ اختیار کرو۔ اگر خدا نخواستہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات ہو تو مولانا اس کی ضرور
 نشان دہی فرمائیں۔ ان کی بڑی عنایت ہوگی لیکن اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، تو پھر سوال یہ ہے
 کہ عام و خاص مسلمانوں کے ساتھ تعلق و برتاؤ میں ہمارا وہ کونسا طرزِ عمل ہے جو مولانا کو ”اکرامِ مسلم“
 کے خلاف نظر آتا ہے، اور خود مولانا کی تبلیغی جماعت کا کیا طرزِ عمل ہے جسے وہ اکرامِ مسلم سمجھتی
 ہے اور ہم سے بھی اس کی پیروی کرنا چاہتی ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ مولانا کو جماعت اسلامی کے اُس طرز عمل پر اعتراض ہے جو اس نے فسق و فجور اور اباحت کے علم برداروں، اور غیر اسلامی تمدن و معاشرت اور معیشت و سیاست کے حامیوں پر تحریک پھینکے میں اختیار کیا ہے۔ مولانا اسی نکتہ چینی اور اسی ادکار و نکر کو اکرام مسلم کے خلاف قرار دے رہے ہیں اور ان کا منشاء ہے کہ جو فتنی و فجاری اور علمبرداران بدعت و ضلالت مسلمانوں کے بھیس میں کام کر رہے ہیں، اولیٰ تو ان سب کی تعظیم و تکریم کر دو اور ان کے خلاف زبان کھولو ہی نہیں، اور اگر اس پر تنقید نہیں کر سکتے تو ان پر علانی الاعلان کھیر نہ کر دو بلکہ ان کی کوٹھیوں پر حاضری دے کہ عاجزی و مسکنت کے ساتھ دست بستہ کچھ خدا رسول کی باتیں عرض کر دیا کرو۔ مولانا کی اپنی جماعت کا رویہ ہندوستان و پاکستان، دونوں جگہ جی ہے۔ اس نے نہ ہندوستان میں کبھی اُن لوگوں کے خلاف آواز اٹھائی جن کی بدولت وہاں بیدینی کا طوفان اٹھ رہا ہے، اور نہ سے پاکستان میں کبھی یہ توفیق ہوئی کہ انفرادی یا اجتماعی طور پر یہاں کی قیادت ناستقہ کے خلاف قول یا عمل کچھ کرتی۔ اسی وجہ سے یہ جماعت پاکستان میں بھی حکومت اور حکام کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنی ہوئی ہے حتیٰ کہ یہاں کے فرمانروا دل سے یہ چاہتے ہیں کہ ”مذہب“ کے لیے اگر کچھ کام کیا جائے تو اسی جماعت کے طریقہ پر کیا جائے، اور اسی وجہ سے جہاں تک جہیں معلوم ہے، اس جماعت کی نہ گریماں ہندوستان کی حکومت کی نگاہوں میں بھی کبھی نہیں ٹھٹھکیں، کیونکہ بودھ مذہب کے ہیکشوروں کی طرح کام کیا جائے تو اس پر تو چنگیز خانی سلطنت کو بھی کبھی اعتراض نہیں ہوا۔

مولانا کا مشورہ دراصل یہ ہے کہ جماعت اسلامی بھی اپنی روش اختیار کرے۔ اسی کا پانیزہ نام انہوں نے ”اکرام مسلم“ رکھا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ اکرام مسلم ایک نہایت خوفناک فتنہ ہے۔ اس فسق و فجور کی تہرمانی کے زمانہ میں اگر اکرام مسلم کے اس اصول کو رہنا بنا کر کوئی تحریک چلا دی جائے اور وہ تحریک مسلمانوں میں مقبول بھی ہو جائے تو اس بات کا شدید اندیشہ ہے کہ تھوڑے دنوں کے اندر وہ سارا فسق و فجور جو آج برپا ہے، مسلمانوں کی نگاہوں میں مبغوض ہونے کے بجائے محبوب و محترم بن جائے گا اور آہستہ آہستہ وہ زمانہ آجائے گا کہ اگر کوئی خدا کا بندہ کسی کے فسق و فجور پر نکیر کرے تو

”اکرامِ مسلم“ کے یہ علمبردار اس کی گردن مار دیں۔ اس وجہ سے اُن لوگوں کا یہ اندیشہ کچھ بجا نہیں ہے جو ”اکرامِ مسلم“ کی اس تحریک کو اکرامِ فساق کا ایک بہانہ سمجھتے ہیں اور یہ اندیشہ رکھتے ہیں کہ اس سے نہ صرف مسلمانوں کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی روح مردہ ہو جائیگی بلکہ مسلمانوں پر ناسقانہ قیادت کو مسلط رکھنے میں یہ تحریک بہت معین ہوگی۔

میں بیان چند احادیث نقل کرتا ہوں جن سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ اسلامی نظامِ حیات میں جاہلی نظامِ زندگی کی آمیزشیں کرنے والوں اور خدا اور رسول کی کھلے بندوں نافرمانی کرنے والوں کے ساتھ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کیا رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

جو لوگ اسلامی نظامِ زندگی میں جاہلی نظامِ زندگی کی آمیزشیں کریں، یعنی اسلام کسی اصولِ حیات کی ہدایت کرتا ہو اور وہ اس کی جگہ کسی اور اصولِ حیات کو فروغ دینے کی کوشش کریں، اسلام کسی طرزِ معاشرت و معیشت کو پسند کرتا ہو اور وہ کسی اور طرزِ معاشرت و معیشت کو مسلمانوں میں مقبول کرنے کی سعی کریں، اسلام کسی نظامِ اجتماعی کو پیش کرتا ہو اور وہ کسی اور نظامِ اجتماعی کے علمبردار بنیں، اُن کے بارے میں نبی کریم صلعم نے ”اکرام“ کے بجائے تم کو یہ ہدایات دی ہیں۔

عن عابثۃ عن النبی صلعم اذہ
قال من احدث فی امرنا هذا ما لیس
منہ فہو رد۔ (بخاری و مسلم)

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے
فرمایا کہ جو چاہے اس نظام میں وہ چیز گھسالاٹے
جو اس کے اندر کی نہیں ہے تو وہ اس کے منہ پر
پھینک ماری جائے۔

بخاری شریف کی ایک دوسری روایت ہے :-

عن ابن عباس عن النبی صلعم الفیض
الناس الی اللہ ثلاثۃ ملحد فی الحرم
ومتبع فی الاسلام سنۃ الجاہلیۃ

ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا کہ
اللہ کے نزدیک سب بڑھکر مغضوب تین ہیں ایک
وہ جو حرم میں خدا کی نافرمانی کرے۔ دوسرا وہ جو

اسلامی نظام حیات میں غیر اسلامی طریقے گھسانے
کی کوشش کرے تبیرا وہ جو کسی مسلمان کی جان
لینے کے ناخنی دیے ہو

وَمَطْلَبُ دِمِ اِمْرِي مُسْلِمٍ بَعِيْثُ حَتِيٍّ
لِيُصْرِ بِنِي دَمْنَه -

مسلم شریف کی روایت ہے

ابن مسعود سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے
فرمایا کہ پھر ان کے یعنی نبی کے اچھے ساتھیوں
اور صالحین کے بعد ایسے لوگ ان کے جہان
بنتے ہیں جو کہتے ہیں وہ جو کرتے نہیں اور کرتے ہیں
وہ جس کا حکم ان کو نہیں دیا گیا، تو جو ان کے خلاف
ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن، جو ان کے خلاف
زبان سے جہاد کرے وہ مومن، اور جو ان کے
خلاف دل سے جہاد کرے وہ مومن۔ اس سے
آگے ایمان کا کوئی ذرہ بھی نہیں ہے۔

عن ابن مسعود عن النبي صلعم - تم
انما تختلف من بعد هم خلف يقولون
ما لا يفعلون ويفعلون ما لا يؤمرون فمن
جاهد هم بيده فهو مؤمن ومن جاهد
لسانه فهو مؤمن ومن جاهد هم بقلبه
فهو مؤمن وليس وراء ذلك من الايمان
حبة خردل مسلم

پھر ذرا اکرام مسلم کے علمبردار حضرات یہ حدیث بھی سنیں:-

ابراہیم بن مسعود سے روایت ہے کہ جس نے
اسلامی نظام حیات میں غیر اسلامی باتیں
گھسانے والے کا احترام (اکرام) کیا اس نے
اسلام کو ڈھلنے کے کام میں مدد کی۔

عن ابراهيم بن مسعود عن النبي صلعم
من وقص صاحب بدعة فقد اعان على
هدم الاسلام (بیہقی)

ایک اور حدیث ملاحظہ ہو جس سے فساق و فجار کے احترام و اکرام کی حقیقت اچھی طرح واضح ہوتی ہے
اذا مدمح الناس غصب الرب تعالیٰ جب کسی فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو اللہ
تعالیٰ کا غضب بھڑکتا ہے اور عرش الہی بل
واقتزله العرش

جاتا ہے۔

ایک اور حدیث ہے :-

لا تقودوا المنافق سید فافہ ان کسی منافق کو اپنا لیڈر نہ کہہ کیونکہ اگر وہ تمہارا لیڈر
یک سیداً فقد اسخطکم سربکم۔ ہو تو تم نے اپنے خدا کو ناراض کیا۔

مولانا محمد منظور صاحب نے پہلی مرتبہ اپنے اس مضمون کے ذریعہ سے ہمیں آگاہ فرمایا ہے
کہ مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم کی یہ تبلیغی تحریک حضرت امام حسنؑ کے اتباع پر قائم ہے اس
لیے نامناسب نہ ہوگا، اگر یہاں امام ممدوح کا بھی ایک قول ہم نقل کر دیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

من دعا انظالم بالبقاء فقد احب جس نے کسی ظالم کے لیے بقا کی دعا کی اس نے اس
ان یحبی اللہ فی امر منہ۔ بات کو پسند کیا کہ خدا کی زمین میں اس کی نافرمانی

ہوتی ہے۔

میں اگر امام مسلم کی تحریک چلانے والوں سے پوچھتا ہوں کہ اگر اس دور فسق و فجور میں مسلمانوں
کو یہ سبق اچھی طرح پڑھا دیا گیا کہ ہر مسلمان کی عزت کرتے رہو خواہ وہ فاسق ہو یا متقی، اور عملاً فاسق
فجاری کو خوشامد اور ان کے تلقین کی عادت ان کے اندر بیج نہ کر دی گئی تو یہ اللہ کے دین کی خدمت ہوگی
یا یہ اس کے دین کا بدم ہوگا؟ دین کے احیاء کی اگر کوئی امید اس علیہ فسق کے زمانہ میں ہے تو اسی
بات سے ہے کہ ابھی خدا کے فضل سے عامہ مسلمین کے اندر فساد و فجور کے خلاف کراہت کا جذبہ
موجود ہے۔ اگر خدا نخواستہ یہ جذبہ بھی اگر امام مسلم کے انجکشن سے کمرہ کر دیا گیا تو کیا اسلام کے احیاء
کی کوئی کوشش کارگر ہو سکے گی؟ اور کیا اس عظیم نقصان کی تلافی صرف اتنی بات سے ہو سکے گی کہ
کچھ مسلمانوں کو کلمہ کی ہتھے یاد ہو گئی!

حیرت ہوتی ہے کہ جو حضرات میلاد اور فاتحہ کرنے والوں کو مبتدع قرار دیتے ہیں اور ان کے
خلاف آئے دن جلسے بجا جاکر تکفیر کے ہنگامے کھڑے کرتے رہے ہیں، نہ ان کے ساتھ میل جول
کو پسند کرتے نہ ان کے پیچھے ان کی نمازیں ہی درست مانتے، وہ ان لوگوں کے اکرام و احترام کی تحریک

چلاتے ہیں جو اسلام کے سلسلے نظام حیات کو دہم برہم کر رہے ہیں اور مغربی جاہلیت کے تمام مفاسد کو اسلام کے اندر اسلام کے نام سے گھسا رہے ہیں۔ اُن کی خوشامد اور رضا جوئی کے لیے وہ اگر ہم مسلم کی آڑ تلاش کی گئی ہے اور جبارت کا یہ عالم ہے کہ اپنی اس روش پر شرمندہ ہونے کے بجائے ایسا ہیں درس دیا جا رہا ہے کہ فلاح دارین کے اس بے ضرر پروگرام کو اختیار کرو۔

مولانا نے اس سلسلہ میں بڑے فخر کے ساتھ یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ مصر کی الاخوان المسلمون بھی دس میں سے ۹ اصول گویا اسی اکرام مسلم کے ضابطہ کی تفصیل و تشریح ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر مولانا کی اس رائے کا علم اخوان المسلمون کو ہو جائے تو وہ غریب اپنے سر پیٹ میں گئے۔ اس لیے کہ اس سے زیادہ سنگین تہمت شاید ان کے اوپر کوئی اور نہیں لگائی جاسکتی۔ ان کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت تو یہی ہے کہ وہ مصر کی موجودہ فاسقانہ قیادت سے بڑی جرأت کے ساتھ کشمکش کر رہے ہیں اور اس کو تبدیل کرنے کے لیے پوری شدت کے ساتھ عوام میں فتنے اور اتباع کتاب و سنت کا فرق و امتیاز بیدار کر رہے ہیں۔ ان کی نسبت یہ کہنا کہ وہ مولانا کی تبلیغی جماعت کی طرح اکرام مسلم کے بیانے اغراض فتنے اور توفیر اصحاب بدعت کا وعظ کرتے پھر رہے ہیں، مولانا کی بڑی زیادتی ہے۔ اخوان المسلمون کا تصور اسلام خدا کے فضل سے مولویانہ و صوفیانہ نہیں ہے۔ وہ اسلام کو بحیثیت ایک ہم گیر نظام حیات کے پیش نظر رکھتے ہیں اور اپنی قوم کے اُن لوگوں کو مجرم سمجھتے ہیں جو جاہلیت کے اصولوں پر زندگی کا نظام چلا رہے ہیں، اس لیے وہ صرف اکرام مسلم کا وعظ نہیں کرتے پھرتے بلکہ اللہ کے دین کو زندگی کے ہر شعبے میں قائم کرنے کے لیے قیادت فاسقہ کے خلاف منظم جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ اپنی قوم کو اسی بات کی دعوت دے رہے ہیں جس بات کی دعوت ہم دے رہے ہیں۔ وہ اپنی قوم کے لیڈروں سے وہی مطالبے کر رہے ہیں جو ہم اپنی قوم کے لیڈروں سے کر رہے ہیں۔ وہ اپنے اہل ملک کے تمام سیاسی مطالبات میں بھی پیش پیش ہیں۔ فلسطین کے جہاد کے سلسلہ میں انہوں نے جو کارنامے انجام دیے وہ واقعی حال سے مخفی نہیں ہیں۔ مصر و سوڈان کے الحاق کی تحریک، علاقہ سوز سے برطانوی انوائج کے انخلاء کا مطالبہ، ۳۶ مہرہ کے معاہدے کی

